رسولِ کامل صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رسولِ کامل ﷺ

ڈاکٹر اسرار احمد

شائع کردہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 03-5869501

نام کتاب ———— رسول کامل ﷺ

بارِ اوّل تا بارِ ہفتم (دسمبر ۱۹۸۳ء تا دسمبر ۱۹۹۵ء) ———— ۱۷۰۰۰

نظرثانی شدہ ایڈیشن:

بارِ ہشتم (اگست ۲۰۰۲ء) ———— ۲۲۰۰

ناشر ———— ناظم نشر و اشاعت' مرکزی انجمن خدام القرآن' لاہور

مقامِ اشاعت ———— ۳۶۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

فون: ۳۔۵۸۶۹۵۰۱

مطبع ———— شرکت پرنٹنگ پریس' لاہور

قیمت (اعلیٰ ایڈیشن) ———— ۴۰ روپے

قیمت (عام ایڈیشن) ———— ۲۰ روپے

ترتیب

پیش لفظ برطبع اوّل

از قلم: شیخ جمیل الرحمٰن مرحوم

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم

پندرھویں صدی ہجری کے پہلے ربیع الاوّل میں پاکستان ٹیلی ویژن نے قومی نشریاتی رابطہ پر یکم تا ۱۲ ربیع الاوّل ۱۴۰۱ھ ''رسولِ کامل ﷺ'' کے عنوان سے بارہ روزہ پروگرام پیش کیا۔ جس میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے نبوت کی اصل غرض و غایت‘ رسولِ اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے مختلف گوشوں اور خصوصیت کے ساتھ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے انقلابی پہلو اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کو موضوعِ بحث بنایا اور قلتِ وقت کے باوجود پندرہ پندرہ منٹ کے اندر ان موضوعات کو اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا۔

یہ بارہ تقاریر ٹیپ سے تحریری شکل میں منتقل کر کے اس عاجز نے انہیں اوّلاً قسط وار ماہنامہ ''میثاق'' کی اکتیسویں جلد (جنوری ۸۲ء تا دسمبر ۸۲ء) میں شائع کیا اور اب انہیں افادۂ عام کے لئے کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے توقع ہے کہ ''رسولِ کامل ﷺ'' سیرتِ مطہرہ کے اہم گوشوں پر طائرانہ نظر کے اعتبار سے بے انتہا مفید ثابت ہوگی۔

احقر جمیل الرحمٰن عفی عنہ

☆☆☆

پس نوشت (بموقع طبع ہشتم)

زیر نظر کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔ گزشتہ ۲۰ برسوں کے دوران اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ کتاب کے اس تازہ ایڈیشن کی طباعت کے موقع پر نہ صرف یہ کہ نئی کمپیوٹر کمپوزنگ کرائی گئی ہے بلکہ عبارت پر نظر ثانی کرتے ہوئے نوک پلک کو مزید سنوارنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

ناظم نشر و اشاعت

۲۶ جولائی ۲۰۰۲ء

(۱)

نبوّت و رسالت اور اس کا مقصد

نحمدہٗ ونصلّی علی رسولہ الکریم — امّا بعد!

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرّجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرّحیم

﴿ رُسُلاً مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلاَّ يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ م بَعْدَ الرُّسُلِ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ ﴾ (النساء : ۱۶۵)

ناظرین کرام! آپ کو معلوم ہے کہ پندرھویں صدی ہجری کا پہلا ربیع الاوّل شروع ہو چکا ہے۔ یہ نبی اکرم ﷺ کی ولادتِ باسعادت کا مہینہ ہے۔ اسی مناسبت سے آپ ﷺ کے ذکرِ جمیل پر مشتمل گفتگوؤں کا یہ سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں اس سے پہلے کہ ہم نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور آپؐ کی سیرتِ مطہّرہ کے مختلف گوشوں کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے گفتگو کریں' مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کی روشنی میں یہ سمجھیں کہ نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت کیا تھا! ہمارا ایمان ہے کہ سیدِ وُلدِ آدم حضرت محمد ﷺ صرف ایک نبی ہی نہیں بلکہ "خاتم النبیّین" ہیں اور صرف ایک رسول ہی نہیں بلکہ "آخر الرُّسلین" ہیں' لہٰذا آپ ﷺ کا مقصدِ بعثت یقیناً وہ بھی ہے جو تمام انبیاء و رُسل کا بنیادی اور اساسی مقصدِ بعثت ہے' لیکن چونکہ آپ ﷺ پر نبوّت و رسالت کا سلسلہ صرف ختم ہی نہیں ہوا بلکہ مکمل ہوا ہے' لہٰذا آپ ﷺ کے مقصدِ بعثت میں ایک تکمیلی اور اتمامی رنگ ہونا ضروری ہے' جو آپؐ کے لئے مابہ الامتیاز ہو اور تمام انبیاء اور رسولوں کی مقدس جماعت میں آپؐ کا منفرد مقام اور امتیازی مرتبہ واضح ہو جائے۔

اسلام کا پورا قصرِ ایمان کی بنیاد پر قائم ہے۔ اور ایمان چند ایسے ماورائی حقائق

کو ماننے کا نام ہے جن تک رسائی حواسِ ظاہری کے ذریعے ممکن نہیں' بلکہ ان تک رسائی کسی درجے میں صرف عقل اور وجدان کی قوتوں کو بروئے کار لا کر ہو سکتی ہے۔ اگر ان امور کو تین بڑے بڑے حصّوں میں جمع کیا جائے تو وہ ایمانیاتِ ثلاثہ کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ یعنی ایمان باللہ یا توحید' ایمان بالآخرت یا ایمان بالمعاد اور ایمان بالرّسالت اور نبوّت۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ان تینوں کے مابین بڑا گہرا منطقی ربط پایا جاتا ہے۔ تفصیلات کو چھوڑ کر اور فلسفیانہ و متکلّمانہ موشگافیوں سے قطع نظر اگر سادہ الفاظ میں سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ ایمان کیا ہے! تو سب سے پہلے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ پوری کائنات' یہ پورا سلسلۂ کون و مکاں جو تاحدِ نگاہ ہماری نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا ہے' جس کی وسعتوں کا تاحال انسان کو کوئی اندازہ نہیں' یہ نہ ہمیشہ سے ہے نہ ہمیشہ رہے گا۔ اصطلاحاً ہم یوں کہیں گے کہ یہ حادث ہے اور فانی ہے۔ البتہ ایک ہستی ہے' ایک ذات ہے' جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ یہ ہستی بالکل تنہا ہے' اکیلی ہے' لاشریک اور یکتا ہے۔ اس کی ذات' اس کی صفات' اس کے حقوق و اختیارات سب حد درجہ لاثانی (unique) ہیں جن میں کوئی کسی اعتبار سے نہ ساجھی ہے نہ شریک ہے۔ اس ہستی میں تمام محاسن و کمالات بتمام و کمال موجود ہیں۔ یہ ہستی ہے جسے ہم اللہ کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ ہے اجمالاً ایمان باللہ یا توحید۔

اس ہستی نے اس کائنات کو پیدا فرمایا۔ اس کی یہ تخلیق بے مقصد نہیں ہے' بے کار و عبث نہیں ہے' بلکہ بالحق (purposeful) ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی :

﴿ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ۝ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ ﴾ (آلِ عمران : ۱۹۰'۱۹۱)

"یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری

سے آنے میں اُن ہوش مندوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں جو اُٹھتے' بیٹھتے اور لیٹتے' ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمینوں کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔ (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) پروردگار! یہ سب کچھ تُو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ ...."

یہ تخلیق بالحق ہے اور اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی' یعنی ایک وقتِ معیّن تک کے لئے ہے۔ اسی خالقِ کائنات نے انسان کو تخلیق فرمایا اور انسان اس سلسلۂ تخلیق کا نقطۂ عروج ہے۔ یہی انسان اَشرفُ المخلوقات اور مسجودِ ملائک بنا۔

اس انسان کی ایک زندگی تو وہ ہے جو وہ اس دُنیا میں بسر کرتا ہے' اس دُنیا میں پیدائش سے لے کر موت تک کا وقفہ' لیکن یہی اس کی کل زندگی نہیں ہے' بلکہ انسانی زندگی ایک نہایت طویل عمل ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

تُو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں' پیہم دواں' ہر دم جواں ہے زندگی!

یہ دُنیا کی زندگی تو درحقیقت اس کی کتابِ زندگی کے صرف دیباچے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی اصل کتابِ زندگی موت کے بعد کھلے گی۔ اس کی اُخروی زندگی ہی اصل زندگی ہے جو ابدی ہے' جو ہمیشہ کی زندگی ہے' جس میں دوام ہے۔ جیسے کہ قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے :

﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ۝﴾

(العنکبوت : ۶۴)

"اصل زندگی کا گھر تو دارِ آخرت ہے۔ کاش یہ لوگ جانتے"۔

انسانی زندگی کے اس طویل سفر میں موت صرف ایک وقفہ ہے۔ بقول شاعر ؎

موت اک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر!

اس طرح زندگی دو حصّوں میں منقسم ہو گئی۔ تو اس سے جو دُنیوی زندگی کا حصّہ جداگانہ متشکل ہوا اس کا مقصد ہے ابتلاء اور امتحان۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿ اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾

(الملک : ۲)

"اُس نے موت اور حیات کا یہ سلسلہ اس لئے بنایا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون ہے اچھے عمل کرنے والا"۔

اس حقیقت کو بھی علامہ اقبال نے نہایت سادہ الفاظ میں ادا فرمایا ؎

قلزمِ ہستی سے تُو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

اس زندگی کے بعد ایک موت آنے والی ہے۔ اس موت کے بعد حشر و نشر ہے۔ جزا و سزا کے فیصلوں کا ایک دن ہے' جسے قرآن مجید "یَوْمُ الدِّین" سے تعبیر فرماتا ہے۔ اُس دن طے ہو گا کہ انسان اپنی حیاتِ دُنیوی میں اپنی سعی وجہد کے اعتبار سے ناکام رہا یا کامیاب قرار پایا۔ اور اس کے بعد وہ اپنی اَبدی زندگی جنت میں بسر کرے گا یا جہنم کے شعلوں میں گزارے گا' جیسا کہ ایک خطبۂ نبویؐ میں الفاظ وارد ہوئے :

((وَاِنَّھَا لَجَنَّۃٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا))

"اور وہ (ابدی زندگی) جنت ہے ہمیشہ کے لئے یا آگ ہے دائمی"۔

پھر اس ابدی زندگی میں یا رَوْحٌ وَّرَیْحَانٌ وَّجَنَّۃُ نَعِیْمٍ کے مزے ہیں یا اللہ تعالیٰ کا شدید عذاب اور اس کی سخت سزا ہے۔ ان تمام امور کو ماننے کا نام ایمان بالآخرۃ ہے۔

اگر غور کیا جائے تو ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ یا ایمان بالمعاد' ان دونوں کے ربط سے اسلام کے تصورِ زندگی کا ایک خاکہ مکمل ہوتا ہے۔ یہ گویا کہ مبدأ و معاد کا آئین ہے۔ اس کے بغیر انسان کا حال بے لنگر کے جہاز جیسا ہے جس کی کوئی سمتِ سفر متعین نہ ہو اور وہ موجوں کے رحم و کرم پر ہو۔ گویا ؎

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!

لیکن اللہ اور آخرت کا یہ علم انسان کی زندگی کی ابتداء اور انتہاء کا تعین کرتا ہے۔ اسی

دونوں (ابتداء اور انتہاء) کو قرآن مجید کے ان حد درجہ جامع الفاظ میں سمو دیا گیا ہے:

﴿ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ○ ﴾ (البقرۃ : ۱۵۶)

"ہم اللہ ہی کے ہیں (اسی کے پاس سے آئے ہیں) اور اسی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے"۔

اب یہاں ایک سوال فطری طور پر سامنے آتا ہے کہ امتحان لیا جاتا ہے کچھ سکھا کر، جانچا اور پرکھا جاتا ہے کچھ دے کر۔ تو یہ جو امتحان ہے جس سے انسان اس حیاتِ دُنیوی میں دوچار ہے' آخر اس کی بنیاد اور اس کی اساس کیا ہے؟ اس کی جانچ اور پرکھ کس اصول پر ہوگی؟ اس سوال کا ایک جواب جو بنیادی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دُنیا میں اس ابتلاء و آزمائش کے لئے بھیجا ہے تو غیر مسلح نہیں بھیجا' بہت سی صلاحیتوں اور استعدادات سے مسلح کرکے بھیجا ہے۔ بڑی پیاری آیت ہے سورۃ الدھر کی:

﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ○ ﴾ (الدھر : ۲)

"ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا تاکہ اسے آزمائیں (اسے جانچیں' اسے پرکھیں)' چنانچہ اس غرض کے لئے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا ہے"۔

اسے سماعت اور بصارت کی استعدادات دے کر دُنیا میں بھیجا۔ مزید برآں اس میں تعقل و تفکر کی صلاحیتیں رکھیں۔ اس میں نیکی اور بدی کی تمیز ودیعت کی۔ جیسے کہ فرمایا گیا:

﴿ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ○ ﴾

(الشمس : ۷'۸)

"اور قسم ہے نفسِ انسانی کی' اور جو اُسے بنایا اور سنوارا (اور اس کی نوک پلک درست کی)' اور اس میں نیکی اور بدی (خیر اور شر) کا علم الہامی طور پر

ودیعت کر دیا"۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر مزید غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قلب انسانی میں اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کی ایک دھیمی سی آنچ رکھ دی ہے۔ ان تمام چیزوں سے مسلح ہو کر انسان اس دُنیا میں آیا ہے۔ لہٰذا اس کی اُخروی بازپرس اور آخرت میں اس کے حساب کتاب کی بنیادی اساس تو یہی ہے۔ گویا کہ ہر انسان اللہ کے سامنے مسئول' ذمہ دار اور جواب دہ ہے' responsible اور accountable ہے' خواہ کوئی نبی آئے ہوتے یا نہ آئے ہوتے' خواہ کوئی کتاب نازل ہوئی ہوتی یا نازل نہ ہوئی ہوتی' ان فطری استعدادات کی بنیاد پر جو انسان کے اندر ودیعت شدہ ہیں' ہر انسان مکلف ہے' مسئول ہے' ذمہ دار ہے' جواب دہ ہے۔ لیکن اس پر رحمت خداوندی کا ایک تقاضا اور ہوا۔ انسان کے اس امتحان میں مزید آسانی پیدا کرنے کے لئے اللہ نے انزالِ وحی' انزالِ کتب' بعثت انبیاء اور ارسالِ رُسل کا سلسلہ جاری فرمایا جو انسان کی اپنی بنیادی استعدادات کے لئے وہ سامان لے کر آئے جن سے ان کو جلا ہو' ذہول و غفلت کے پردے اٹھ جائیں' اگر آئینہ قلب پر کوئی زنگ آ گیا ہے تو دُور ہو جائے۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مزید رحمت ہے' مزید فضل ہے۔ گویا نبوّت اس پہلو سے رحمت ہے۔ اور یہی وہ نکتہ ہے جو سمجھ لینا چاہئے کہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ میں یہ رحمت بے پناہ وسعت پذیر ہو گئی ہے اور اس نے تمام جہانوں کا احاطہ کر لیا ہے۔ نبوت اصلاً رحمت ہے' لیکن محمدؐ رسول اللہ ﷺ رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گئے۔ آپؐ کی رحمت تمام جہانوں پر محیط ہو گئی۔

لیکن اسی کا ایک دوسرا پہلو بھی سامنے رہے' وہ یہ کہ نبیوں کی آمد' رسولوں کی بعثت اور کتابوں کے نزول کے بعد اب محاسبۂ اُخروی کے لئے انسان پر اتمامِ حجت ہو گیا۔ انسان کے پاس اب کوئی عذر نہ رہا' وہ کوئی بہانہ پیش نہ کر سکے گا کہ پروردگار! ہمیں معلوم نہ تھا کہ تو کیا چاہتا ہے' ہم نہیں جانتے تھے کہ تیری رضا کس میں ہے' ہمیں علم نہیں تھا کہ تو کن باتوں سے ناراض ہوتا ہے! یہ عذر اگر کسی درجے میں

قابلِ پذیرائی ہو سکتا تھا تو نبوّت و رسالت کے بعد اب اس کا امکان قطعاً ختم ہو گیا۔ اس کو آپ قطعِ عذر سے تعبیر کریں یا اتمامِ حُجّت کا نام دیں۔ بعثتِ انبیاء اور ارسالِ رُسل سے ایمان بالآخرت کے ضمن میں انسان کی ذمہ داری اور اس کی مسئولیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ یہی ہے وہ بات جو اس آیۂ مبارکہ میں ارشاد ہوئی تھی جسے آغازِ کلام میں تلاوت کیا گیا تھا :

﴿ رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ﴾ (النساء : ۱۶۵)

یعنی ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا بشارت دینے والے بنا کر اور خبردار کرنے والے بنا کر۔ اہلِ حق کے لئے' طالبینِ ہدایت کے لئے' صحیح راہ پر چلنے والوں کے لئے وہ مُبشّر ہیں' بشارت دینے والے ہیں کہ ان کے لئے جنّتِ نعیم میں نہایت روشن مستقبل منتظر ہے۔ اور اہلِ زیغ کے لئے' کج روی اختیار کرنے والوں کے لئے' گمراہی کی روش اختیار کرنے والوں کے لئے وہ خبردار کر دینے والے' warn کر دینے والے ہیں' تاکہ لوگوں کے پاس اللہ کے مقابل' اللہ کے ہاں کوئی حجت باقی نہ رہ جائے' رسولوں کے بعد وہ کوئی عذر نہ کر سکیں' محاسبۂ آخروی کے وقت کوئی بہانے نہ بنا سکیں۔ ﴿ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ﴾ اللہ زبردست ہے۔ وہ جس طرح چاہے حساب لے' اس کا اختیار مطلق ہے' کوئی اس سے پوچھنے والا نہیں۔ لیکن وہ حکیم بھی ہے' اس نے اپنی اس بازپرس کے لئے ایک نہایت حکمت بھرا نظام تجویز فرمایا ہے۔ اور یہی ہے وہ نظام جس کی اہم ترین کڑی ہے سلسلۂ نبوت و رسالت۔

فَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ○

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○○

(۲)

تاریخِ نبوّت

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم   بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ﴾ (المؤمن : ۷۸)

از روئے قرآن حکیم صفحۂ ارضی پر قافلۂ انسانیت اور قافلۂ نبوّت و رسالت نے ایک ساتھ سفر کا آغاز کیا۔ یعنی پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے پہلے نبی بھی تھے' اور آدمِ ثانی حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول تھے۔ اس کے بعد قافلۂ آدمیت اور قافلۂ نبوت و رسالت ساتھ ساتھ سفر جاری رکھتے رہے۔ ایک طرف مادّی ارتقاء کا عمل جاری رہا' وسائل و ذرائع میں ترقی ہوتی چلی گئی' انسان کے مادّی علوم کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا تو ساتھ ساتھ ہدایتِ آسمانی' ہدایتِ خداوندی بھی ارتقائی مراحل طے کرتی چلی گئی' تاآنکہ نبوت اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذاتِ مبارکہ میں اور بالآخر اختتام کو پہنچ گئی محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیتِ مقدّس میں' اور رسالت اپنے نقطۂ عروج کو پہنچی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ میں اور پھر آپؐ ہی کی شخصیت میں وہ قیامت تک کے لئے قائم و دائم ہو گئی۔

اگرچہ ہم یقین کے ساتھ یہ نہیں جان سکتے کہ اس دنیا میں کل کتنے رسول آئے' لیکن بطورِ اصول یہ بات قرآن مجید میں ایک سے زائد مرتبہ واضح کر دی گئی کہ انبیاء و رسل صرف وہی نہیں ہیں جن کا قرآن میں ذکر ہے۔ چنانچہ آغاز میں سورۃ المؤمن کی جس آیت مبارکہ کے ابتدائی حصے کی تلاوت کی گئی تھی اس کا ترجمہ یہ ہے :

"(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ سے پہلے ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں' جن میں

سے وہ بھی ہیں جن کے حالات ہم نے آپ کو بتادیئے اور ایسے بھی بہت سے رسول ہیں کہ جن کے حالات ہم نے آپ کو نہیں بتائے"۔

یہی مضمون سورۃ النساء میں بھی بیان ہوا ہے۔ بعض روایات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انبیاء کی تعداد سوا لاکھ ہے اور ان میں سے جو رسول بھی تھے ان کی تعداد تین سو تیرہ ہے۔

نبوّت و رسالت میں کیا فرق ہے اور ان کے مابہ الامتیاز امور کون کون سے ہیں! ان میں محققین کے نزدیک کسی قدر اختلاف پایا جاتا ہے' لیکن ایک بات پر اجماع ہے کہ نبوّت عام ہے اور رسالت خاص' یعنی ہر رسول تو لازماً نبی بھی ہے' لیکن ہر نبی لازماً رسول نہیں ہوتا۔ خالص فنی اصطلاحات اور ان کے مباحث سے ہٹ کر سادہ الفاظ میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ نبوت ایک ذاتی مرتبہ ہے اور رسالت ایک منصب ہے۔ جیسے کہ ہمارے ہاں ایک cadre ہے سی ایس پی' لیکن پھر کسی C.S.P. کی تقرری (appointment) ہے۔ وہ کسی ضلع کا ڈپٹی کمشنر یا کسی وزارت میں سیکریٹری کے عہدے پر فائز ہوتا ہے۔ یہ اس کا منصب ہے۔ اسی طرح نبوت ایک ذاتی مرتبہ و مقام ہے اور رسالت ایک منصب ہے۔ چنانچہ کسی رسول کو فائز کیا جاتا ہے متعین طور پر کسی شہر' یا ملک یا قوم کی طرف مبعوث فرما کر۔

قرآن مجید میں بہت سے انبیاء کا بھی ذکر ہے اور بہت سے رسولوں کا بھی۔ ان میں سے چھ رسولوں کا ذکر قرآن مجید بار بار کرتا ہے' اس اعتبار سے کہ جن قوموں کی طرف وہ بھیجے گئے انہوں نے ان کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا اور اس کی پاداش میں ان پر دنیا ہی میں عذابِ استیصال یعنی جڑ کاٹ دینے والا عذاب نازل کیا گیا اور ان کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ بمصداق آیت قرآنی: ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ "پس جڑ کاٹ دی گئی اس قوم کی جس نے ظلم کیا"۔ یعنی رسول کا انکار کرنے والی قوم کی جڑ کاٹ دی گئی' اس کو نسیاً منسیا کر دیا گیا' جیسے کہ کوڑے

لرنٹ کا ڈھیر ہو کہ اس کو آگ لگا کر ختم کر دیا جائے۔

یہ رسول جن کا ذکر سورۃ الاعراف' سورۃ یونس' سورۃ ہود' سورۃ الشوریٰ' سورۃ المؤمنون اور دیگر متعدد سورتوں میں بار بار آیا ہے' یہ ہیں حضرت نوح' حضرت ہود' حضرت صالح' حضرت لوط' حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہم السلام۔ اگر ذرا غور کیا جائے تو ان میں بڑی عجیب تقسیم یہ نظر آتی ہے کہ تین رسول حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ ماقبل سے تعلق رکھتے ہیں اور تین کو زمانہ مابعد حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہم عصر ہیں' لیکن چونکہ ان کے بھتیجے ہیں' ان سے چھوٹے ہیں' لہٰذا اس تقسیم میں انہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کے بعد شمار کیا جا سکتا ہے۔ گویا کہ انبیاء اور رسل کی تاریخ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت ایک مرکزی شخصیت کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔ ان کی تین نسبتیں ہیں اور تینوں نہایت بلند ہیں۔ ایک جانب وہ خلیل اللہ ہیں' دوسری طرف وہ ابوالانبیاء ہیں' ان کی نسل سے سینکڑوں انبیاء اور رسول اٹھے یہاں تک کہ ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم بھی انہی کی نسل سے ہیں' پھر قرآن مجید اِمَامَۃُ النَّاس کا منصب بھی ان کے لئے قرار دیتا ہے۔ فرمایا گیا:

﴿ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ ﴾ (البقرۃ : ۱۲۴)

"اور جس وقت آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے کئی باتوں (آزمائشوں) کے ساتھ پس اس نے ان سب کو پورا کیا۔ (اللہ نے) فرمایا (اے ابراہیم) تحقیق میں تجھ کو سب لوگوں کا امام بنانے والا ہوں"۔

لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ ہیں' ابوالانبیاء ہیں اور امام الناس ہیں۔ یہ تینوں نسبتیں نہایت عظیم ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ مرتبہ نبوت کے اعتبار سے حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت بلند مقام پر فائز ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے تشریف لانے والے جن تین رسولوں کا ذکر

قرآن مجید میں بار بار آیا ہے ان کے حالات کو اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ضمن میں صرف ایک ہی جرم کا ذکر ملتا ہے' ان کی قوموں کی ایک ہی گمراہی ہے جس پر انہوں نے نکیر کی' جس پر انہوں نے روک ٹوک کی' جس سے باز آنے کی انہوں نے دعوت دی' اور وہ شرک کا جرم ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور تمدنی' سماجی یا کسی اور طرح کی بے راہ روی کا ذکر نہیں ملتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قومِ نوح' قومِ ہود اور قومِ صالح کے زمانے تک ابھی انسانی تمدن اپنے ابتدائی مراحل (stages) میں تھا جس میں گمراہی بس ایک شرک ہی کی صورت میں موجود تھی۔ اس کے علاوہ انسانی زندگی اور اس کے متعلقات اور دوسرے پہلو ابھی کسی نہ کسی حد تک فطرت کے قریب تر واقع ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت نوح' حضرت ہود اور حضرت صالح علیہم السلام کی دعوت میں ایک ہی نکتہ نظر آتا ہے:

﴿ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ﴾

"اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو (اس کی بندگی اور پرستش میں کسی اور کو شریک نہ ٹھہراؤ' اس لئے کہ حقیقتاً) اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں"۔

لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد جن تین رسولوں کا ذکر آتا ہے ان کی قوموں میں ہمیں نظر آتا ہے کہ تہذیب و تمدن اور انسان کی حیاتِ اجتماعی کے مختلف گوشوں میں گمراہی کی وہ صورتیں ظاہر ہوئیں جو اگرچہ اسی شجرۂ خبیثہ کے برگ و بار ہیں' یعنی شرک ہی کے یہ نتائج اور لوازم ہیں' لیکن یہ کہ بالفعل ان کا ظہور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کے بعد ہو رہا ہے۔ چنانچہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم میں ہمیں جنسی بے راہ روی (Sexual perversion) نظر آتی ہے جو سماج کی جڑوں کو کھوکھلا کر دینے والی چیز ہے۔ اس لئے کہ انسان کی معاشرت اور اس کا معاشرتی نظام درحقیقت عورت اور مرد کے تعلقات کے صحیح بنیادوں پر استوار ہونے سے ہی برقرار رہ سکتا ہے۔

اس کے بعد حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے بارے میں قرآن جو ذکر کرتا ہے تو اس میں ان کے ہاں معاشی بے راہ روی نظر آتی ہے۔ اس قوم میں ناپ تول میں کمی ہونے لگی، دھوکہ فریب شروع ہو گیا، لوگوں کے مال ناجائز طور پر ہڑپ کیے جانے لگے، راہ زنی ہونے لگی۔ چنانچہ حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت قرآن مجید میں بیان ہوتی ہے تو اس میں نہایت نمایاں پہلو یہ ہے کہ لوگو! ایک اللہ کی بندگی اور اس کی پرستش کرو اور لوگوں کے اموال پر ڈاکہ زنی نہ کرو، ان کے حقوق نہ مارو، ناپنے میں اور تولنے میں کمی نہ کرو۔

﴿ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ ﴾ (ھود : ۸۵)

"اور میری قوم کے لوگو! پورا کرو ناپ کو اور تول کو انصاف کے ساتھ، اور کمی نہ کرو لوگوں کی چیزوں میں ..."

اس سے آگے بڑھ کر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا جا رہا ہے آلِ فرعون کی طرف۔ اور یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ سیاسی جبر و استبداد کی ایک بہت نمایاں مثال سامنے آتی ہے۔ ایک قوم دوسری قوم پر اس طرح مسلط ہو گئی ہے کہ اس نے اس کو بالفعل اپنا غلام بنا کر رکھ لیا ہے۔ ان سے بالجبر کام لیا جا رہا ہے، ان پر اس درجہ ظلم روا رکھا جا رہا ہے کہ ان کی اولادِ نرینہ ہلاک کر دی جاتی ہے اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھ لیا جاتا ہے۔ یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام سامنے آتے ہیں اور اس ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں ﴿ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ "بنی اسرائیل کو (جسے تم نے جبر اور ظلم کے شکنجے میں کسا ہوا ہے) ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دے دو"۔

یہ تین رسول جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد ہوئے ہیں، خاص طور پر دنیا کے اس خطے میں آئے جو کہ عرب کے آس پاس تھا، جس کی تاریخ سے اہلِ عرب واقف تھے جن میں نبی اکرم ﷺ کی بعثت ہو رہی ہے۔ ان کے حالات میں گویا کہ انسانی

اجتماعیت جس جس پہلو سے فساد کا شکار ہو سکتی ہے ان کی نشان دہی کر دی گئی۔ اس کے بعد ایک اُمّت کی تاریخ شروع ہوتی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے۔ بنی اسرائیل کی حیثیت ایک اُمّتِ مُسلمہ کی ہے جو کتابِ الٰہی کی حامل اور شریعتِ خداوندی کی امین تھی، جس نے اللہ کے ساتھ ایک عہد و میثاق کیا تھا۔ اس کی تاریخ قرآن مجید بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں پے بہ پے انبیاء آتے رہے اور ایک مُصلح کی حیثیت سے ان میں ایک تجدیدی کارنامہ سرانجام دیتے رہے۔ جب کبھی ان کے اندر ایمانی جذبات سرد پڑنے شروع ہوئے یا ان کے اعمال و اخلاق کے اندر کجی راہ پانے لگی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت و رسالت نے انہیں سہارا دیا۔ اس سلسلۂ انبیاءِ بنی اسرائیل کے خاتم ہیں حضرت مسیح علیہ السلام، اس سلسلے کے آخری رسول، جو گویا کہ بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری حجت بن کر سامنے آئے۔ اور ان کے بعد چھ سو برس کا عرصہ فترتِ اولیٰ کا زمانہ کہلاتا ہے جو تمہید ہے دراصل ختمِ نبوّت اور اتمامِ رسالت کی۔ یہ چھ سو سال تاریخ انسانی میں اس اعتبار سے پہلی مرتبہ ایک وقفہ ہے کہ جس کے دوران پورے کرۂ ارضی پر کوئی رسول اور نبی نہیں تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اب نبوتِ محمدی ﷺ کا خورشید ہدایت طلوع ہوا، جن پر نبوت ختم اور رسالت کی تکمیل ہوئی۔ اس فترتِ اولیٰ کا عرصہ لگ بھگ ۵۷۱ برس ہے، اس لئے کہ آنحضور ﷺ کی ولادت باسعادت سن عیسوی کے حساب سے ۵۷۱ء میں ہوئی اور آپ پر آغازِ وحی ۶۱۰ء میں ہوا۔ اس طرح یہ چھ سو سال ہیں جن کے دَوران یہ فترتِ اُولیٰ ہمیں نظر آتی ہے، جو تمہید ہے مستقل فترت کی جس میں نبی اکرم ﷺ پر نبوت اور رسالت کا خاتمہ ہو گیا۔ یہاں یہ بات جان لینی چاہئے کہ آنحضور ﷺ پر نبوت صرف ختم ہی نہیں ہوئی ہے بلکہ مکمل بھی ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ ختمِ نبوّت پر تو ہمارے ہاں کافی زور ہے، اپنی جگہ یہ ایک واقعہ ہے، حقیقت

ہے اور اس کی ایک قانونی اہمیت بھی ہے ' جس کی وجہ سے یہ مسئلہ زیادہ نمایاں ہوا ہے ' لیکن اگر غور کیا جائے تو آنحضور ﷺ کی فضیلت کی بنیاد ختم نبوت نہیں ' بلکہ تکمیلِ نبوت و رسالت ہے۔ ذرا وہ آیہ مبارکہ ملاحظہ کیجئے جو سورۃ المائدۃ میں ہے :

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾ (المائدۃ : ۳)

"آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے ' اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے ' اور تمہارے لئے اسلام کو بطورِ دین پسند کر لیا ہے"۔

اس پر یہودیوں نے بجا طور پر بصد حسرت مسلمانوں سے کہا تھا کہ اے مسلمانو! یہ عظیم آیت جو تمہیں عطا ہوئی ہے اگر کہیں ہم پر نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس کے یوم نزول کو اپنی سالانہ عید بنا لیتے۔

یہ ہے وہ مقام کہ جہاں نبی اکرم ﷺ رسولِ کامل کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں ' جن پر رسالت صرف ختم ہی نہیں ہوئی بلکہ مکمل ہو گئی ہے ' جن پر نبوت کا صرف اختتام ہی نہیں ہوا بلکہ اتمام ہوا ہے۔ اس اتمامِ نبوت اور اکمالِ رسالت کے مظہر کیا ہیں! ان پر ان شاء اللہ بعد میں گفتگو ہو گی۔

فَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ ○

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○○

(۳)

ختمِ نبوّت اور اس کے لوازم

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ۝ ﴾ (الفتح : ۲۸)

یہ آیۂ مبارکہ سورۃ الفتح میں وارد ہوئی ہے۔ اس کا جزوِ اعظم دو اور سورتوں یعنی سورۃ التوبہ اور سورۃ الصف میں بھی بعینہٖ انہی الفاظ میں آیا ہے :

﴿ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ﴾

قرآن حکیم میں تین مقامات پر ایک مضمون کا دہرایا جانا یقیناً ان الفاظ کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے اس آیۂ مبارکہ کو پورے قرآن مجید کا عمود قرار دیا ہے، یعنی یہ وہ مرکزی خیال ہے جس کے گرد قرآن حکیم کے تمام مضامین گھومتے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ذرا غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ضمن میں تو یقیناً یہ الفاظِ مبارکہ "کلید" کا درجہ رکھتے ہیں، کیونکہ انہی کے فہم پر دارومدار ہے اس کا کہ ہم اس بات کو سمجھ سکیں کہ انبیاء و رسل کی مقدس جماعت میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا امتیازی مقام کیا ہے! اس لئے کہ یہ الفاظ آنحضور ﷺ کے لئے تو قرآن کریم میں تین بار آئے ہیں، لیکن کسی دوسرے نبی یا رسول کے لئے نہ صرف یہ الفاظ بلکہ اس کے قریب المفہوم الفاظ بھی پورے قرآن حکیم میں کہیں وارد نہیں ہوئے۔

ذرا ان الفاظ پر توجہ کو مرتکز کیجئے، ان کا ترجمہ یہ ہے :

"وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو الہدیٰ کے ساتھ اور دین حق دے کر' تاکہ غالب کر دے اس کو پورے کے پورے دین پر' اور کافی ہے اللہ بطورِ گواہ۔"

ان الفاظِ مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی امتیازی شان سامنے آتی ہے۔ اس آیت کے ایک ایک لفظ پر غور کیجئے! اس آیت میں آنحضور ﷺ کے لئے لفظ "رَسُوْلَهٗ" وارد ہوا ہے۔ اس سے اشارہ ہوتا ہے اس بات کی طرف کہ بقیہ انبیاء و رُسل کی نسبتیں اور اُن کی امتیازی حیثیتیں کچھ دوسری ہیں۔ مثلاً حضرت آدم علیہ السلام صفیّ اللہ ہیں' حضرت نوح علیہ السلام نجیّ اللہ ہیں' حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ ہیں' حضرت اسماعیل علیہ السلام ذبیح اللہ ہیں' حضرت موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ ہیں' لیکن حضرت محمد ﷺ رسول اللہ ہیں۔ گویا کہ منصبِ رسالت جس مقدس ہستی پر اپنے نقطۂ عروج اور نقطۂ کمال کو پہنچا ہے وہ ہے ذاتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آپ سے پہلے تمام انبیاء و رُسل کی بعثت صرف اپنی اپنی قوموں کی طرف ہوئی۔ سب کی دعوت قرآن مجید میں نقل ہوئی ہے' لیکن اُن کا خطاب ہمیشہ ایک ہی رہا :

﴿ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ﴾

"اے میری قوم کے لوگو! بندگی اور پرستش اختیار کرو اللہ کی جس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔"

پس معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ سے قبل تمام انبیاء و رُسل کی بعثت ان کی اپنی اپنی قوموں کی طرف ہوئی تھی۔ اس مقدس جماعت میں محمد رسول اللہ ﷺ وہ پہلے اور آخری نبی اور رسول ہیں جن کا خطاب پوری نوعِ انسانی سے ہے' بحیثیت نوعِ انسانی۔ چنانچہ قرآن مجید میں آنحضور ﷺ کی دعوت کے ضمن میں بار بار الفاظ آئیں گے :

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ﴾ "اے لوگو!"

قرآن مجید میں جب آپ ﷺ کی دعوت کا آغاز ہوتا ہے تو آفاقی انداز سے ہوتا ہے۔ سورۃ البقرۃ کے تیسرے رکوع کی پہلی آیت ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ . . . ﴾

"اے بنی نوعِ انسان! اپنے رب کی بندگی اور پرستش کرو جس نے تم کو پیدا کیا ہے۔"

خود حضور ﷺ اپنی زبانِ مبارک سے ارشاد فرماتے ہیں:

((اِنِّيْ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ خَاصَّةً وَّاِلَى النَّاسِ كَافَّةً))

"(اے قریش!) میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف بالخصوص اور پوری نوعِ انسانی کی طرف بالعموم۔"

یہ الفاظ آپ ﷺ کے ایک خطبے میں وارد ہوئے ہیں جس کو نہج البلاغۃ کے مؤلف نے نقل کیا ہے۔

قرآن مجید میں بھی یہ مضمون آیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا . . . ﴾

(سبا:۲۸)

"(اے محمد ﷺ!) ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر پوری نوعِ انسانی کے لئے بشیر و نذیر بنا کر . . . ."

اور یہی مفہوم ہے اس آیت مبارکہ کا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ ﴾ (الانبیاء:۱۰۷)

"اور (اے محمد ﷺ!) نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر جہانوں کے لئے رحمت بنا کر۔"

پس جان لیجئے کہ یہ خصوصیت صرف محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ہے کہ آپؐ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کی جانب ہے ـــــ اور یہ اصل میں اس لئے ہے کہ آپ ﷺ سے پہلے واقعتاً دنیا میں ذرائع رسل و رسائل (Means of

(Communication) ایسے نہ تھے کہ کسی ایک نبی یا رسول کی دعوت پر پوری نوعِ انسانی کو جمع کیا جا سکتا۔ اس میدان میں مادّی وسائل و ذرائع کے سلسلے میں جو ارتقاء ہوا ہے اس کا یہ نتیجہ ہے کہ اب اس رسالتِ کاملہ کا ظہور ہو جس کی دعوت پوری نوعِ انسانی کے لئے بیک وقت ہو اور جو مبعوث ہو اِلَی الْاَسْوَدِ وَالْاَحْمَرِ' تمام انسانوں کی جانب' خواہ وہ افریقہ کے سیاہ فام لوگ ہوں' خواہ یورپ کے سرخ رو لوگ ہوں' یا مشرق کے زرد رو لوگ ہوں۔

آیت زیر مطالعہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی ...... ﴾

"وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ کے ساتھ..."

الْهُدٰی سے یہاں مراد قرآن حکیم ہے۔ یہ پہلی چیز ہے جو حضور ﷺ لے کر مبعوث ہوئے' جو ہدایتِ کاملہ و تامّہ ہے۔ جو هُدًی لِّلنَّاس ہے' هُدًی لِّلْمُتَّقِیْن ہے' شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْر ہے۔

اس ضمن میں بھی ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہمارا ایمان ہے کہ تورات بھی اللہ کی کتاب تھی' انجیل بھی اللہ کی کتاب تھی' حضرت داؤد علیہ السلام کو زبور بھی اللہ ہی نے عطا فرمائی تھی' بلکہ قرآن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی صحیفے عطا فرمائے گئے تھے' دیگر انبیاء و رُسل کو بھی صحیفے دیے گئے ہوں گے' لیکن ان میں سے کسی کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے نہیں لیا تھا۔ ان میں سے بعض کتابیں تو دنیا سے ناپید ہو گئیں' "صحفِ ابراہیم" کا کہیں کوئی وجود نہیں' اور بعض کتابیں جو موجود ہیں ان کے بارے میں ان کے ماننے والے بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی اصل صورت میں موجود ہیں' نہ ہی وہ اُس زبان میں ہیں جس میں وہ اصلاً نازل ہوئی تھیں۔ ان کتابوں کو ماننے والے خود تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی کتابیں محرف ہیں ــــــ لیکن قرآن مجید کی حفاظت کا اللہ نے خود ذمہ لیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس کو بصراحت بیان کر دیا گیا:

﴿ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۝ ﴾ (الحجر : ۹)

"ہم نے ہی اس ذکر (قرآن) کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

تمام ائمہ امت اور تمام جمہور مُسلمین کا اس پر اجماع ہے کہ اس آیتِ مبارکہ میں "ذکر" سے مراد قرآن حکیم ہے۔

خود قرآن ہی میں اس کا ایک نام "ذِکری" بھی بیان ہوا ہے۔ اس کی وجہ بھی سمجھ لیجئے۔ سابقہ کتابیں در حقیقت اسی کتاب ہدایت کے ابتدائی ایڈیشن تھے جس کتابِ ہدایت کا آخری اور مکمل ایڈیشن قرآن حکیم ہے۔ جس طرح انسان کے مادی ذرائع و وسائل نے ارتقائی مراحل طے کئے اسی طرح انسان کے ذہن اور شعور کا معاملہ بھی ارتقاء پذیر رہا۔ انسان جب اپنے عقلی بلوغ کو پہنچا' اپنی عقلی' ذہنی اور فکری صلاحیتوں کے اعتبار سے پختہ (mature) ہوا تو یہ وہ وقت تھا کہ اب اسے ہدایتِ کاملہ و تامّہ یعنی ابدی ہدایت مکمل طور پر دے دی جائے۔ لہٰذا اس کی حفاظت کی بھی ضرورت تھی۔ اس لئے کہ اس سے پہلے کی کتابیں ابدی نہ تھیں' وہ ہمیشہ کے لئے نازل ہی نہیں ہوئی تھیں' اس لئے ان کی حفاظت مشیّتِ الٰہی میں تھی ہی نہیں۔ اگر ہوتی تو نہ یہ گم ہوتیں اور نہ ہی ان میں تحریف ہو سکتی ——— ہمیشہ کے لئے ہدایت' آخری ہدایتِ کاملہ و تامّہ وہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ لے کر آئے۔ اس ہدایت نامے کو تاقیامِ قیامت نافذ العمل رہنا تھا' لہٰذا اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے خود لیا۔

دوسری چیز جو حضور ﷺ لے کر آئے یا دے کر بھیجے گئے وہ دینِ حق ہے' وہ ایک نظامِ اجتماعی ہے' ایک ایسا نظامِ عدلِ اجتماعی جس میں سب کے حقوق و فرائض کا ایک نہایت معتدل اور متوازن نظام موجود ہے' جس میں کوئی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتا۔ یہ وہ میزان ہے جس میں سب کے حقوق و فرائض کا تعین کر دیا گیا ہے۔ اس میزان سے تول کر ملے گا' جس کو جو کچھ ملے گا' قسط' عدل اور انصاف سے

ہر فرد کو' ہر شخص کو اُس کی ناگزیر ضروریاتِ زندگی ملیں گی۔

غور کیجئے کہ ایک نظامِ اجتماعی اس دَور کے انسان کی اصل ضرورت ہے۔ ایک نظامِ عدل کی پوری نوعِ انسانی احتیاج رکھتی ہے۔ جہاں تک انفرادی اخلاقیات کا تعلق ہے سابقہ انبیاء و رُسل بھی اس لحاظ سے بہت بلندیوں تک پہنچ چکے تھے۔ ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ ذاتی اور نجی اخلاق کے اعتبار سے حضرت مسیح علیہ السلام بھی بہت بلند مقام پر پہنچ چکے تھے' لیکن جس دَور کے فاتح ہیں حضرت محمد ﷺ اس دَور میں انسانی اجتماعیت بھی ارتقائی مراحل طے کر کے اس مقام تک آ چکی ہے کہ اجتماعیت کا پلّہ انفرادیت پر کافی بھاری ہو چکا ہے۔ انفرادیت اجتماعیت کے شکنجے میں کسی جا چکی ہے اور اب اجتماعیت کی گرفت انتہائی مضبوط ہے۔ اب ایک ایسے نظامِ اجتماعی کی ضرورت ہے جس میں انفرادی سیرت و اخلاق کے ساتھ ساتھ ایک صالح معاشرہ بھی موجود ہو' یعنی پوری اجتماعیت بھی صالح ہو۔ یہ ذہن میں رکھئے کہ ابتداءً قبائلی نظام کے تحت قبیلہ ہی ایک مکمل اجتماعی یونٹ بن گیا تھا' سیاسی اعتبار سے بھی' سماجی اعتبار سے بھی اور معاشی اعتبار سے بھی۔ پھر ذرا انسان نے ترقی کی' تمدن نے ارتقاء کا مرحلہ طے کیا تو شہری ریاستیں قائم ہوئیں۔ اس کے بعد انسان نے اور قدم آگے بڑھایا تو بڑی بڑی بادشاہتیں (Empires)' بڑی بڑی مملکتیں قائم ہوئیں اور بڑی بڑی سلطنتوں کا دَور آیا ـــــ یہ وہ دَور ہے جب محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہو رہی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ وہ نظام لے کر آئے جو انسانوں کے مابین عدل اور قسط کی ضمانت دے' جس میں کوئی طبقہ دوسرے کے حقوق پر دست درازی نہ کر رہا ہو' جس میں نہ فرد جماعت کے بوجھ تلے سسک رہا ہو نہ جماعت اور اس کے تقاضے انفرادیت پسندی کی بھینٹ چڑھ گئے ہوں۔ ایسا نظامِ عدل و قسط صرف دینِ حق ہے' جو خالق کائنات کی جانب سے بواسطہ اپنے آخری رسولؐ نوعِ انسانی کو دیا گیا۔ اسی کو قرآن "دین الحق" کہتا ہے۔

اب ظاہر بات ہے کہ ایک بہتر نظام' نہایت عادلانہ نظام' نہایت منصفانہ نظام

اگر صرف کسی کتاب کی زینت ہو' کسی کتاب کے اوراق میں لکھا ہوا موجود ہو تو وہ نوعِ انسانی کے لئے حجت اور دلیل نہیں بن سکتا۔ کوئی بھی نظام لوگوں کے لئے حجت' دلیل اور قاطعِ عذر حقیقی معنوں میں اُس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک کہ اس کو قائم کر کے اور چلا کر دکھانہ دیا جائے' اور اس دین حق کی برکات و حسنات کا انسان عملی طور پر تجربہ نہ کر لے۔

آپ کے علم میں ہے کہ افلاطون نے بھی ایک بہت اعلیٰ کتاب (Republic) لکھی جس میں اس نے نظری اعتبار سے بہت عمدہ نظام تجویز کیا' لیکن یہ پوری دنیا کو معلوم ہے کہ وہ نظام کبھی ایک دن کے لئے بھی' دنیا میں کسی ایک مقام پر بھی قائم نہیں ہوا۔ چنانچہ اس کی حیثیت ایک خیالی جنت (Utopia) کی ہے۔ وہ ایک ایسی چیز ہے جو کہ ناممکن العمل ہے۔ اس کے برعکس محمدؐ رسول اللہ ﷺ جو نظام لے کر آئے وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے' وہ ایک طرف اخلاقی تعلیم کا حسین ترین مرقع ہے تو دوسری طرف اجتماعی زندگی سے متعلق نہایت اعلیٰ و ارفع' معتدل و متوازن اور منصفانہ نظام کا حامل ہے۔

سورۃ الشوریٰ میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے اعلان کرایا:

﴿قُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ﴾

"(اے نبیؐ!) کہہ دیجئے کہ میں اس کتاب پر ایمان لایا ہوں جو اللہ نے نازل کی ہے' اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے مابین نظامِ عدل قائم کروں۔"

اس آیت کی رو سے نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت یہ قرار پایا کہ آپ ﷺ اس نظامِ عدل و قسط کو پورے کے پورے نظامِ زندگی پر غالب کریں' قائم کریں' نافذ کریں جو اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا۔ چنانچہ دینِ حق کے غلبے کے لئے ہمیں سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ایک عظیم انقلابی جدوجہد نظر آتی ہے۔ ایک

مکمل انقلاب بلکہ تاریخِ انسانی کا عظیم ترین انقلاب تو وہ ہے جو محمدِ عربی ﷺ نے برپا کیا' اور ایک مکمل انقلابی جدّوجُہد کا خاکہ ہمیں آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے تیئس (۲۳) برس میں نظر آتا ہے ـــــ بلکہ شمسی ماہ و سال کے لحاظ سے یہ عرصہ ساڑھے اکیس برس بنتا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس مختصر عرصے میں ایک عظیم انقلاب برپا کیا' اور اس دینِ حق کو عملاً دنیا میں نافذ کرکے اس کا ایک نمونہ نوعِ انسانی کے لئے پیش کر دیا۔

چوتھی چیز جو بہت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے' وہ یہ کہ آپ ﷺ کی انقلابی جدّوجُہد میں قدم قدم پر مشکلات و مصائب اور موانع ہیں۔ یہ جدّوجُہد نبی اکرم ﷺ نے خالص انسانی سطح پر کرکے دکھائی ہے۔ آپ ﷺ نے وہ ساری تکلیفیں جھیلی ہیں جو کسی بھی انقلابی جدّوجُہد میں کسی بھی داعیِ انقلاب کو اور انقلابی کارکنوں کو جھیلنی پڑتی ہیں۔ وہ تمام شدائد' وہ تمام موانع' وہ تمام مشکلات' وہ تمام آزمائشیں اور وہ تمام تکالیف اور مصائب جو کسی بھی انقلاب کے علم برداروں اور کسی بھی انقلاب کے کارکنوں کو جھیلنی پڑتی ہیں وہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے بنفسِ نفیس جھیلی ہیں۔ اس کا بھی ایک سبب ہے جو پیشِ نظر رہنا چاہئے۔ یہ انقلاب صرف عرب کے لئے نہیں تھا بلکہ پوری نوعِ انسانی اور پورے عالمِ ارضی کے لئے تھا۔ محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اس کی تکمیل فرما دی اور اس کے بعد عالمی سطح پر اس کی تکمیل کا فریضہ اُمت کے حوالے کرکے آپ ﷺ نے "اَللّٰھُمَّ فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی" کہتے ہوئے رفیقِ اعلیٰ جلّ شانہٗ کی طرف مراجعت اختیار فرمائی۔

ظاہر ہے کہ بعد میں اس انقلاب کی تکمیل جن لوگوں کو کرنی تھی انہیں خالص انسانی اور بشری سطح پر اس فرضِ منصبی کو ادا کرنا تھا۔ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کوئی شک نہیں کہ آپ ﷺ محبوبِ ربّ العالمین ہیں' اور اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے' وہ چاہتا تو اپنے محبوب کے پاؤں میں کانٹا تک نہ چبھنے دیتا اور آپ کا فرضِ منصبی بھی مکمل ہو جاتا ـــــ لیکن فی الواقع ایسا نہیں ہوا۔ آنحضور

ﷺ نے ساری مصیبتیں جھیل کر' ساری تکلیفیں برداشت کر کے دین کو بالفعل قائم و نافذ فرما کر اُمت پر ہمیشہ کے لئے ایک حجت قائم کر دی ہے کہ اللہ کے اس دین حق کو اب اُمت نے غالب اور نافذ کرنا ہے' اور اس راہ کی تمام مصیبتیں جھیل کر' تمام قربانیاں دے کر' تمام مشکلات سے عہدہ برآ ہو کر اب یہی کام اُمت نے کرنا ہے۔ اب یہ فرض مسلمانوں نے انجام دینا ہے۔ جب محبوبِ رب العالمین سرورِ دو عالم ﷺ نے مصیبتیں اٹھا کر خالص انسانی سطح پر یہ کام انجام دیا ہے تو مسلمانوں کو بھی اس کے لئے تیار رہنا ضروری ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے' جو اپنی جگہ صد فیصد درست ہے' کہ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ میں تمام انبیاء و رُسل کے اوصاف اور محاسن جمع ہیں۔ بقول شاعر ؎

حسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری!

لیکن ساتھ ہی وہ بات بھی پیش نظر رہے جو آنحضور ﷺ نے فرمائی کہ تمام نبیوں اور رسولوں نے جتنی تکلیفیں برداشت کیں میں نے تنہا وہ سب کی سب برداشت کی ہیں۔

فَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۝

(۴)

حیاتِ نبوی قبل از آغازِ وحی

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم　بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ○ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ○ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ○ ﴾ (الضحٰی : ۶-۸)

انبیاء و رُسل کے عمومی مقصدِ بعثت، تاریخ نبوت و رسالت اور نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی امتیازی شان کے بارے میں اجمالی گفتگو کے بعد اب آیئے کہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے مختلف ادوار پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا وہ دَور جو پیدائش سے لے کر آغازِ وحی تک ہے اس کے بارے میں واقعہ یہ ہے کہ ہمارے پاس مستند اور مصدّقہ معلومات بہت کم ہیں۔ البتہ اس ضمن میں اگر قرآن مجید کی طرف رجوع کیا جائے اور سورۃ الضحیٰ کی متذکرہ بالا تین آیات کو اپنے ذہن میں عنوانات کے طور پر تجویز کر لیا جائے تو حیاتِ طیبہ قبل از آغازِ وحی کے بارے میں جو بھی باتیں مصدقہ معلومات کی بنیاد پر ہمارے پاس ہیں وہ تمام باتیں اور معلومات ان تین آیات کے ذیل میں بڑی خوبی کے ساتھ انہی کی شرح و تفسیر کی حیثیت سے تین عنوانات کے طور پر شامل ہو جائیں گی۔

جہاں تک نبی اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت کی تاریخ کا تعلق ہے محتاط ترین اندازوں کے مطابق آپ ۹ ربیع الاوّل عام الفیل کو پیدا ہوئے جو انگریزی تقویم کے مطابق اغلباً ۲۰۔ اپریل ۵۷۱ء بنتی ہے۔ یہاں سے آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا ابتدائی دَور شروع ہوتا ہے جو دراصل ﴿ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ○ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ○ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ○ ﴾ کی مکمل تفسیر ہے۔

آپ ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے تو اس حال میں کہ والدِ ماجد عبداللہ کا انتقال آپؐ کی ولادت باسعادت سے قبل ہی ہو چکا تھا۔ چھ سال تک والدہ ماجدہ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کا سایہ بھی آپؐ سے اٹھالیا۔ نتیجتاً آپ ﷺ اپنے دادا عبدالمطلب کے زیرِ کفالت اور زیرِ تربیت آئے' لیکن دو ہی سال بعد یتیمی کا ایک اور داغ آپؐ کو دیکھنا پڑا اور انتہائی محبت اور شفقت کرنے والے دادا کی شفقت و محبت کا سایہ بھی آپؐ سے اٹھالیا گیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک آپؐ اپنے بڑے تایا زبیر بن عبدالمطلب کے زیرِ کفالت رہے' اور پھر اپنے دوسرے تایا ابو طالب کے زیرِ سرپرستی آپؐ نے اس حیاتِ دُنیوی کی ابتدائی منزلیں طے کیں۔ آپؐ نے ابتدائی دَور میں شبانی (گلہ بانی) کا وہ فریضہ بھی سرانجام دیا ہے جو غالباً تمام انبیاء و رُسل کا ایک مشترک وصف رہا ہے۔ جس کے بارے میں علّامہ اقبال نے نہایت خوبصورتی سے کہا ہے ؎

اگر کوئی شعیب آئے میسّر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

آپ ﷺ نے گلہ بانی کی۔ اور یہ بات جان لینی چاہئے کہ عرب کے لق و دق صحرا میں' ایک ایسی فضا میں جہاں دُور دُور تک کوئی متنفس نظر نہ آتا ہو' اوپر آسمان کا سایہ' نیچے پھیلی ہوئی زمین' اِدھر اُدھر پہاڑ ـــــ یہ درحقیقت فطرت سے قریب ترین ہونے کی ایک کیفیت ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنا ابتدائی دَور اس کیفیت میں بسر کیا ہے گویا کہ کتابِ فطرت کا مطالعہ دل کھول کر کیا۔ جس کی طرف ایک اشارہ ہے قرآن مجید کے آخری پارے کی سورۂ مبارکہ میں :

﴿ اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ○ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ○ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ○ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ○ ﴾ (الغاشیۃ : ۱۷-۲۰)

"کیا یہ دیکھتے نہیں اونٹ کی تخلیق کو کہ اس میں کیسی کیسی نشانیاں مضمر ہیں

اللہ کی حکمت اور قدرت کی! انہیں اندازہ نہیں کہ آسمان کی رفعت کیا اشارے کر رہی ہے! کیا پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جما دیئے گئے ہیں! کیا یہ غور نہیں کرتے کہ زمین کی وسعت کس بات کی گواہی دے رہی ہے!"

یہ ہے وہ کتاب فطرت جس کے مطالعے سے انسان اپنے فاطر کے قریب ترین آتا ہے ـــــ اور اس کے بھرپور مواقع محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو بالکل ابتدائی زندگی میں میسر آئے۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے کاروبار شروع فرمایا۔ یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ نبی اکرم ﷺ نے کسی خانقاہ میں تربیت حاصل نہیں کی' کسی گوشے میں بیٹھ کر کوئی نفسیاتی ریاضتیں کر کے تزکیۂ نفس نہیں کیا۔ آپؐ زندگی کے عین منجدھار میں رہے' آپؐ نے بھرپور زندگی بسر کی۔ آپؐ نے اپنے وقت کی اعلیٰ ترین سطح پر کاروبار کیا اور اس کاروبار میں لوگوں نے آپؐ کے اخلاق اور آپؐ کی سیرت و کردار کا لوہا تسلیم کیا۔ آپؐ کے حسنِ معاملہ اور دیانت و امانت کی وجہ سے آپؐ کو "الصّادق" اور "الامین" کا خطاب آپؐ کے معاشرے نے دیا۔ تو یہ خطابات ایسے ہی نہیں مل گئے' بلکہ اصل بات یہ ہے کہ آپؐ کے کردار کا لوہا لوگوں نے اگر واقعتاً مانا ہے تو اپنے تجربات کی بنیاد پر مانا ہے۔ سنن ابی داؤد میں ایک صحابی ایک واقعہ بیان کرتے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ آغازِ وحی سے قبل کسی کاروباری معاملے میں میری اور محمد ﷺ کی کچھ گفتگو ہو رہی تھی' اچانک مجھے کوئی کام یاد آیا اور میں حضور ﷺ سے اجازت لے کر چلا گیا کہ ذرا آپؐ انتظار فرمائیں' میں ابھی آیا۔ حضور ﷺ نے وعدہ فرمالیا کہ اچھا میں یہیں تمہارا انتظار کروں گا۔ میں کہیں گیا اور جا کر کچھ ایسا مصروفیات میں گم ہوا کہ مجھے اپنا وعدہ یاد ہی نہ رہا۔ تین دن بعد اچانک یہ خیال آیا کہ میں نے تو محمد ﷺ سے وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ میں گھبرایا ہوا اس جگہ پر پہنچا تو میں نے یہ دیکھا کہ محمد ﷺ وہیں مقیم تھے۔ آپؐ نے مجھے کوئی ملامت نہ کی' فرمایا تو صرف اس قدر کہ بہرحال میں اپنے وعدے کی بنیاد پر پابند ہو گیا تھا کہ میں تمہارا انتظار کرتا ـــــ یہ ایک ایسا

واقعہ ہے کہ اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اہلِ مکّہ کو محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت مطہرہ کا کس قسم کا تجربہ ہوا تھا۔ یہ آپؐ کا اخلاق و کردار تھا، جس کی وجہ سے آپؐ اُن کی آنکھوں کا تارا بنے اور آپؐ کو انہوں نے "الصّادق" اور "الامین" کا خطاب دیا۔

آپؐ کی جوانی کے دَور کے چند اور واقعات میں سے ایک جنگِ فجار میں آپؐ کی شمولیت ہے۔ آپؐ کے تایا زبیر بن عبد المُطّلب بنی ہاشم کے علم بردار تھے اور آپؐ بھی ان کے پہلو بہ پہلو اس جنگ میں شریک ہوئے، اس لئے کہ قریش اس جنگ میں حق پر تھے۔ اگرچہ اس کی صراحت ملتی ہے کہ آنحضور ﷺ نے کسی کا خون نہیں بہایا، اس لئے کہ صرف قومی یا خاندانی معاملات کے لئے کسی انسانی جان کا لینا، یہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے شایانِ شان نہ تھا۔ اس جنگ کے بعد قریش کے کچھ نوجوانوں نے ایک عہد کیا جسے "حِلف الفضول" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہوں نے باہمی معاہدہ کیا کہ وہ ظالم کی مخالفت کریں گے، مظلوم کی حمایت کریں گے، حق اور صداقت کے راستے کی تلقین کریں گے۔ آنحضور ﷺ بھی اس حلف میں شریک ہوئے اور آپ ﷺ بعد میں فرمایا کرتے تھے کہ آج بھی اگر اس قسم کے کسی معاہدے کی طرف مجھے دعوت دی جائے تو میں اس پر لبیک کہوں گا۔

خانہ کعبہ کی تعمیر کے موقع پر بھی آپ ﷺ کے تدبّر اور فراست کا ایک بہت ہی نادر نمونہ سامنے آیا۔ الغرض آپؐ کی زندگی کا یہ جو دَور ہے اس میں ہمیں وہ مظہر نظر آتے ہیں جن کی طرف اشارہ ملتا ہے قرآن مجید کی سورۂ نون میں، جس کا دوسرا نام سورۃ القلم بھی ہے:

﴿ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ ﴾

"اور (اے محمد ﷺ!) بلاشبہ آپ اخلاقِ حسنہ کی بلندیوں پر فائز ہیں۔"

کاروبار ہی کے ضمن میں آنحضور ﷺ کا تعلق یا آپ کا معاملہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہوا۔ ان کا معاملہ بھی یہ ہے کہ ایک طرف یہ عرب کی متموّل ترین خاتون

تھیں۔ چنانچہ روایات میں اس کی صراحت ملتی ہے کہ جب قریش کے قافلے سامانِ تجارت لے کر جاتے تھے تو تنہا ان کا سامانِ تجارت بلحاظ تمام لوگوں کے مجموعی سامان سے زیادہ ہوتا تھا۔ پھر دوسری طرف ان کی عفت و عصمت اور پاک دامنی کا عالم یہ تھا کہ عرب کے اس معاشرے میں ان کو "الطاہرۃ" کا خطاب دیا گیا ــــ یہ گویا کہ بالکل ایک فطری اور قرینِ عقل اور قرینِ قیاس بات ہے کہ یہ قِرانُ السَّعْدَین ہوتا اور "الصّادق" اور "الامین" کا نکاح "اَلطّاہرۃ" سے ہوتا ــــ مشیّتِ الٰہی میں یہی طے تھا۔ بہرحال حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے نکاح کی صورت میں وہ بات سامنے آتی ہے جو سورۃ الضحیٰ میں ان الفاظ میں وارد ہوئی :

﴿ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰیO ﴾

"(اے محمد ﷺ!) اور پایا آپ کو تنگ دست‘ پس (آپؐ کو) غنی کر دیا۔"

جہاں تک قلبِ محمدیؐ کا تعلق ہے وہ تو بیشک غنی تھا‘ لیکن ظاہری اور دُنیوی اعتبار سے جسے ہم تنگ دستی کہتے ہیں اُس کی اگر کوئی کیفیت نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں اب تک رہی بھی تھی تو اب جبکہ مکہ کی متمول ترین خاتونؓ آپؐ کے حبالۂ عقد میں تھیں‘ جو انتہائی جاں نثار اور اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے والی بیوی تھیں‘ اس کے بعد اس دُنیوی احتیاج یا کمزوری کا بھی کوئی معاملہ باقی نہ رہا۔

حضور ﷺ کی زندگی کا یہ دَور ایک بھرپور ازدواجی زندگی کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ ایک محبت کرنے والی جاں نثار اور وفادار بیوی رفیقۂ حیات ہیں ــــ اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ان زوجہ محترمہ سے اولاد بھی عطا فرمائی۔ ایک انتہائی باعزت اور بافراغت زندگی آپؐ بسر فرما رہے تھے۔ لیکن اب آپؐ کے اندر داعیہ اُبھرا اور توجّہ کائنات‘ خالقِ کائنات اور عالمِ بالا کی طرف مبذول و منعطف ہوئی۔ اب غور و فکر کا مادہ کسی اور رُخ پر پروان چڑھنا شروع ہوا۔ چنانچہ ہمیں وہ روایت ملتی ہے جس کی راویہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں اور بخاری شریف میں یہ روایت پہلے ہی باب میں موجود ہے کہ جب آپ ﷺ کی عمر شریف ۴۰ برس کے لگ بھگ

ہوئی تو آپؐ کو خلوت گزینی محبوب ہو گئی اور آپؐ غارِ حرا میں خلوت گزینی اختیار فرماتے تھے۔ (حُبِّبَ اِلَیْہِ الْخَلَاءُ فَکَانَ یَخْلُوْ بِغَارِ حِرَاء)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ غارِ حرا میں آپ ﷺ عبادت کرتے تھے۔ اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ عبادت کس قسم کی تھی؟ آپؐ کسی سابقہ اُمت میں نہ تھے' کسی نبی کے پیرو نہ تھے' کوئی عبادت کا طریقہ ایسا نہیں تھا کہ جو آپؐ کو کسی اور نبی کی پیروی یا کسی اور اُمت میں ہونے کی وجہ سے معلوم ہوتا' اور حضرت جبرئیل سے ابھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ تو یہ عبادت کیسی تھی؟ اس کا جواب شارحینِ حدیث نے یہ دیا ہے کہ : کان صفۃُ تعبُّدہٖ فی غار حراء التفکُّر والاعتبار یعنی غارِ حرا میں آپؐ کی عبادت غور و فکر اور عبرت پذیری پر مشتمل تھی۔ سوچ بچار' کتابِ فطرت کا مطالعہ' خود اپنی فطرت کی گہرائیوں میں غواصی اور نگاہِ عبرت سے ماحول کا جائزہ و تجزیہ' یہ تھی آپؐ کی غارِ حرا میں عبادت۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎ اپنے مَن میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی!

یہ غور و فکر کہ نوعِ انسانی کس حالت میں مبتلا ہے' خاص طور پر خود آپؐ کی قوم اخلاق کے اعتبار سے کتنی پستی میں مبتلا ہو چکی ہے' کس طرح شرک کا دور دورہ ہے' معبودِ حقیقی سے لوگ کس طرح اپنا رُخ موڑ چکے ہیں' یہ سارا غور و فکر نوعِ انسانی کی ضلالت اور گمراہی پر وہ بھاری رنج و غم تھا جس کے بارے میں قرآن مجید میں بار بار گواہی ملتی ہے:

﴿ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾

(الشعراء : ۳)

"کیا آپؐ اپنے آپ کو اس رنج اور صدمے کی وجہ سے ہلاک کر لیں گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے"۔

یہ وہ کیفیات تھیں جن کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ غارِ حرا میں اعتکاف فرما رہے تھے۔ اسی عالم میں پردے اٹھتے ہیں' اور صرف پردے ہی نہیں اٹھتے بلکہ آپؐ پوری

نوعِ انسانی کی ہدایت پر مامور کئے جاتے ہیں اور آپ کا دورِ دعوت تاقیامِ قیامت مقرر کیا جاتا ہے۔

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
اٹھتے ہیں حجاب آخر کرتے ہیں خطاب آخر!

یہ ہے تفسیر سورۃ الضحیٰ کے ان الفاظ کی:

﴿ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى ۝ ﴾

"اور (اللہ نے) پایا آپ کو (حقیقت کی تلاش میں) سرگرداں تو آپ پر راہِ ہدایت منکشف کر دی"۔

گویا غارِ حرا کی خلوتوں میں آپ ﷺ حقیقت کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے انہی دروازے کھول دیے گئے، پردے اٹھا دیے گئے۔ حضرت جبرائیل امین سے ملاقات ہوئی، وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلی ملاقات جس میں نزولِ وحی کا آغاز ہوا، بیداری اور نیند کے بین بین کی سی کیفیت یعنی نیم بیداری کے عالم میں ہوئی۔ بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبرائیلؑ کے پاس کوئی لکھی ہوئی تختی تھی جس پر یہ آیات مرقوم تھیں:

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ ﴾ (العلق: ۱ تا ۵)

تین مرتبہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((مَا اَنَا بِقَارِئٍ)) "میں پڑھ نہیں سکتا"۔

حضرت جبرائیل نے آپ ﷺ کو اچھی طرح سے لگا کر بھینچا اور اس کے بعد اس وحی کا آپ ﷺ کے قلبِ مبارک میں نقش قائم ہو گیا۔ یہاں سے گویا حضور رسول اللہ ﷺ کا دورِ رسالت شروع ہو گیا۔ اس کے بعد نزولِ وحی میں کچھ وقفہ رہا ہے،

پھر جو آیات نازل ہوئیں وہ سورۃ المدثر کی یہ ابتدائی آیات تھیں :

﴿ یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَاَنْذِرْ ○ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ○ ﴾

(المدّثر : ۱تا۳)

یعنی اے لحاف اوڑھ کر لیٹنے والے! کھڑے ہو جایئے' کمر کس لیجئے! فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں ہمہ تن اور ہمہ وقت مصروف ہو جایئے' اور اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کیجئے اور اس کی کبریائی کو فی الواقع دنیا میں قائم کیجئے۔ یہ ترجمانی ہے سورۃ المدثر کی ابتدائی تین آیات کی۔ بہت سے محققین کی یہ رائے بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے کہ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات سے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا آغاز ہوا اور سورۃ المدثر کی ان ابتدائی آیات سے آپ ﷺ کی رسالت کا آغاز ہوا۔ واللہ اعلم!

فصلی اللّٰہ علیه وعلٰی آله وصحبه وسلم تسلیمًا کثیرًا کثیرًا

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ○○

(۵)

مکّی دَور ـــ دعوت' تربیت اور تنظیم

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ـ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُO قُمْ فَاَنْذِرْO وَرَبَّکَ فَکَبِّرْO ﴾

(المدثر : ۱ تا ۳)

اس سے قبل یہ بات سامنے آچکی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی امتیازی شان غلبۂ دینِ حق ہے' یعنی اس دینِ حق کو بالفعل قائم' غالب اور نافذ کرنا جو آپ ﷺ دے کر بھیجے گئے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے ایک مکمل انقلابی جِدّوجُہد درکار ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کی سیرتِ مطہّرہ میں ہمیں وہ تمام مراحل نظر آتے ہیں جو کسی بھی انقلابی جِدّوجُہد میں پیش آنے لازمی ہیں۔ یہی بات ہے جو سورۃ المدّثّر میں نہایت سادہ الفاظ میں فرمائی گئی ہے : ﴿ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْO ﴾ "اور (اے محمد ﷺ!) اپنے ربّ کی کبریائی کا اعلان کرو (اور اسے بالفعل قائم اور نافذ کرو)"۔

اس انقلابی جدّوجہد کا پہلا مرحلہ جو ہمیں آپ ﷺ کی حیاتِ طیّبہ کے مکی دَور میں نظر آتا ہے وہ دعوت و تبلیغ' تزکیہ اور تنظیم پر مشتمل ہے۔ جہاں تک تنظیم کا تعلق ہے اس کی بنیاد تھی لا الٰہ الاّ اللہ کے ساتھ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان اور آپؐ کی بے چون وچرا اطاعت اور آپ ﷺ سے بہ دل وجان محبت۔ یہی وہ چیز ہے جس نے آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں کو ایک بنیانِ مرصوص بنادیا' ایک ایسی طاقت اور ایک ایسی قوت کہ جو حضور ﷺ کے اشاروں پر حرکت کرتی تھی۔ آپؐ کے چشم واَبرو کے اشارے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنا تن من دھن سب کچھ نچھاور کرنے کے لئے ہردم آمادہ رہتے تھے۔

جہاں تک دعوت یا تبلیغ کا تعلق ہے اس کے ضمن میں سب سے پہلے تو یہ بات

پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ اس کا مرکز و محور' اس کا منبع اور اس کا مدار قرآن حکیم ہے۔ دعوت ہو یا تبلیغ' انذار ہو یا تبشیر' نصیحت ہو یا موعظت' یہاں تک کہ تربیت ہو یا تزکیہ' ان سب کی اساس اور بنیاد قرآن مجید پر ہے۔ یہ بات قرآن حکیم میں چار مقامات پر آئی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا جو منہجِ عمل اور طریقۂ کار ہے اس کی بنیاد ان عناصرِ چہار گانہ پر ہے:

﴿ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾

"(ہمارا یہ رسول ﷺ) ان پر اس (یعنی اللہ) کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب یعنی احکامِ الٰہی اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔"

اسی حقیقت کو مولانا حالی نے نہایت سادہ الفاظ میں یوں ادا فرمایا ۔

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا!

پس یہ بات سامنے رہنی چاہئے کہ اگرچہ اس دعوت کا ہدف اور مقصود تکبیرِ ربّ یا اعلائے کلمۃ اللہ یا اظہارِ دینِ حق ہے' از روئے نصِّ قرآنی:

﴿ هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ﴾

"وہی (اللہ) ہے جس نے بھیجا اپنا رسول الہدیٰ اور دینِ حق دے کر تاکہ وہ (رسول) اس کو کل جنسِ دین پر پورے کا پورا غالب کر دے"۔

لیکن اس کا نقطۂ آغاز ہے "اِنذار" یعنی خبردار کرنا' آگاہ کرنا' وقوعِ قیامت سے خبردار کرنا' جزاء و سزائے اُخروی سے خبردار کرنا۔ یہ خبردار (warn) کرنا' یعنی "اِنذار" دعوتِ نبوی کا نقطۂ آغاز ہے۔ اور یہ بات جان لینی چاہئے کہ نبی اکرم ﷺ کے نقشِ قدم پر اگر کبھی کوئی دعوت اٹھانی اور برپا کرنی مقصود ہو تو اس کا نقطۂ آغاز بھی "اِنذار" ہی ہوگا۔

پھر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اس دعوت کے ضمن میں ہمیں نبی اکرم ﷺ کی سیرت مطہرہ میں ایک نہایت فطری اور حکیمانہ تدریج نظر آتی ہے۔ یہ دعوت "الاَقرب فالاَقرب" کے اصول پر آگے بڑھتی ہے۔ چنانچہ اس کا آغاز خود آپ ﷺ کے گھر سے ہوا۔ آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں میں سب سے پہلے آپؐ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ہیں۔ ان کے بعد آپؐ کے چچازاد بھائی ہیں جو آپؐ کے زیر کفالت بھی ہیں اور زیر تربیت بھی' یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ' پھر آپؐ کے انتہائی گہرے دوست ہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور پھر آپؐ کے وہ غلام ہیں کہ جنہیں آپؐ نے آزاد کر کے اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا' یعنی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ۔ یہاں سے دعوت آگے بڑھی کنبے اور قبیلے کی طرف۔ پھر جب تک کہ آپؐ اہلِ مکہ سے مایوس نہیں ہو گئے آپؐ نے اپنی پوری دعوتی سرگرمی مکے تک ہی محدود رکھی۔ مکے والوں سے مایوس ہو کر ۱۰ نبوی میں آپؐ نے طائف کا سفر کیا' لیکن اہلِ طائف بھی اسلام کی دعوت سے محروم رہے۔

پھر جب مکے والوں کی مخالفت کی بناء پر آپ ﷺ کو ہجرت کرنا پڑی تب بھی چھ سال کے عرصے تک' جب تک کہ اہل عرب نے صلح حدیبیہ کی شکل میں آپؐ کی حیثیت کو تسلیم نہ کر لیا' آپؐ نے اپنی تمام تر توجہات اندرونِ ملک عرب ہی مرتکز رکھیں۔ صلح حدیبیہ کے بعد آپ ﷺ نے بیرونِ ملک دعوت کا آغاز فرمایا۔ یہ ہے تدریج جو بالکل فطری اور نہایت حکیمانہ ہے۔

آخری بات اس ضمن میں یہ بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ دعوت و تبلیغ کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ نے وہ تمام وسائل اختیار فرمائے جو اس وقت موجود تھے۔ چنانچہ جب آپ ﷺ کو حکم ہوا کہ :

﴿ وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ۝ ﴾ (الشعراء : ۲۱۴)

"اور (اے نبیؐ!) خبردار کیجئے اپنے قبیلے اور قرابت داروں کو"۔

تو آپ ﷺ نے دو دفعہ دعوتِ طعام کا اہتمام فرمایا' اور وہاں اپنی دعوت پیش کی'

اگرچہ بظاہر احوال اور ہمارے دنیوی معیارات کے اعتبار سے یہ دونوں کوششیں ناکام رہیں۔ بعد میں جب سورۃ الحجر نازل ہوئی تو آپؐ کو یہ حکم ہوا:

﴿ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ ﴾ (الحجر: ۹۴)

"پس (اے نبیؐ) آپؐ علی الاعلان دعوت دیجئے اس بات کی جس کا آپؐ کو حکم دیا گیا ہے!"

یعنی اب ڈنکے کی چوٹ وہ بات کہیے جس کے لئے آپؐ مامور ہوئے ہیں' تو آپ ﷺ نے کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر وہی نعرہ بلند کیا جس کا عرب میں رواج تھا: واصباحا! "ہائے وہ صبح جو آنے والی ہے" جس پر لوگ جمع ہو گئے۔ اور آپ ﷺ نے جب انہیں عذابِ آخرت سے خبردار کیا تو آپؐ کا سگا تایا ابولہب مجمع میں سے بول اٹھا: "تَبًّا لَكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا" ــــ معاذ اللہ' نقل کفر' کفر نباشد ــــ "(اے محمد ﷺ!) تمہارے ہاتھ ٹوٹ جائیں' کیا تم نے ہمیں اس کام کے لئے جمع کیا تھا؟" اس پر سورۃ اللّھب نازل ہوئی جس کی پہلی آیت ہے:

﴿ تَبَّتْ يَدَا اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ ﴾ (اللّھب: ۱)

"(اصل میں تو) ہاتھ ٹوٹ گئے ابولہب کے اور ہلاک و برباد ہو گیا وہ خود"۔

یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ دعوت و تبلیغ کے میدان میں ابتداء تو اگرچہ آں حضور ﷺ نے خود فرمائی' لیکن جو لوگ آپؐ پر ایمان لائے ان میں سے ہر شخص اپنی جگہ پر ایک داعیٔ حق بن گیا۔ ان میں نمایاں ترین مقام حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے۔ آپ ﷺ پر ایمان لانے کے بعد وہ خود مجسّم داعی بن گئے' خود مبلّغ بن گئے۔ چنانچہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جو چوٹی کے دس صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں' جنہیں ہم عشرہ مبشرہ کے نام سے جانتے ہیں' ان میں سے چھ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں ایمان لائے۔ ان میں حضرت عثمان بھی ہیں' حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بھی ہیں' حضرت طلحہ بھی ہیں' حضرت زبیر بھی ہیں اور حضرت سعد بن ابی وقاص بھی ہیں' رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاھم۔ دعوت کے اس

عمل پر جو ردِ عمل کفار کی طرف سے اور سردارانِ قریش کی جانب سے ظاہر ہوا اُس میں بھی ہمیں ایک عجیب ترتیب نظر آتی ہے' وہی ترتیب جو ہمیشہ کسی انقلابی دعوت کے خلاف ردِ عمل میں ظاہر ہونی ضروری ہے۔ چنانچہ فوری ردِ عمل جو ابتدا میں ظاہر ہوا وہ استہزاء اور تمسخر کا تھا۔ گویا کہ چٹکیوں میں بات اڑانے ہی کی کوشش کی گئی۔ حضور ﷺ کو مجنون قرار دیا گیا' آپ پر معاذ اللہ پاگل پن کی پھبتی کسی گئی۔ کہا گیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خللِ دماغی کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے' یا شاید کسی آسیب کا اثر ہو گیا ہے' یہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہیں' اچھے بھلے آدمی تھے نہ معلوم کیا ہوا۔ (نقلِ کفر' کفر نباشد) نبی اکرم ﷺ جب یہ باتیں سنتے تھے اور آپ کے قلبِ مبارک پر رنج و اندوہ کی کیفیت طاری ہوتی تھی تو تسلی و تشفی و دلجوئی کے لئے وحیِ الٰہی نازل ہوتی تھی۔

﴿ نٓ ۚ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ ﴾

(القلم : ۱۔۴)

"نٓ' قسم ہے قلم کی اور اُس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں۔ (اے نبیؐ) آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں' اور یقیناً آپ کے لئے نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ اور بے شک آپ اعلیٰ اخلاق کے مرتبے پر فائز ہیں"۔

اس کے بعد جب بات آگے بڑھی' قریش نے یہ دیکھا کہ جسے ہم ایک مُشتِ غبار سمجھے تھے وہ تو ایک بہت بڑی آندھی کی صورت اختیار کر رہی ہے' ہمارے اقتدار' ہماری سیادت' ہماری دیرینہ روایات' ہمارے تہذیب و تمدن اور ہمارے عقائد و مذہب کے خلاف ایک بہت بڑی انقلابی جدوجہد کا آغاز ہو چکا ہے' گویا کہ علامہ اقبال کے الفاظ میں انہوں نے دیکھا کہ ؎

"نظامِ کہنہ کے پاسبانو یہ معرضِ انقلاب میں ہے!"

تو اب پھر وہی ردِ عمل ظاہر ہوا جو ہمیشہ ظاہر ہوتا ہے' یعنی بہیمانہ تشدد' شدید مزاحمت

(persecution) ۔۔۔ اور ظاہر بات ہے کہ اس کا سب سے بڑا حصہ انہی صحابہ ؓ کے حصے میں آیا جو کہ غلاموں کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے' جن کا کوئی حامی نہیں تھا' جن کی طرف سے کوئی بولنے والا نہیں تھا' جیسے حضرت بلال' حضرت خباب بن الارت' حضرت سمیہ اور آلِ یاسر ؓ۔ ان سب پر جو کچھ بیتی وہ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ کے بڑے انمٹ نقوش ہیں' اور انہوں نے جس طرح صبر و استقامت اور جس پامردی کے ساتھ ان تمام مصائب کو جھیلا ہے اور ایمان پر ثابت قدم رہے ہیں وہ تاریخ دعوت و عزیمت کے نہایت اہم نشاناتِ راہ ہیں۔

جب یہ محسوس کر لیا گیا کہ ہمارے یہ تمام حربے ناکام ہو چکے' کسی ایک شخص کو بھی ہم ایمان سے کفر میں نہیں لا سکے' ہمارا یہ سارا تشدد ناکام ہو چکا' تو پھر تیسرا ردِ عمل سامنے آیا۔ چنانچہ تیسرا حربہ آزمایا گیا۔ یہ حربہ ہے مصالحانہ پیش کشوں کا' یہ جال ہے لالچ کا۔ چنانچہ ابنِ ربیعہ قریش کی طرف سے نمائندہ بن کر حضور ﷺ کی خدمت میں آتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اے محمد! (ﷺ) اگر تم بادشاہت کے خواب دیکھ رہے ہو تو اگرچہ ہم اس مزاج کے نہیں ہیں کہ کسی کو بادشاہ مان سکیں' لیکن تمہیں ہم اپنا بادشاہ بھی تسلیم کر لیں گے' اگر تمہیں دولت چاہئے تو ذرا اشارہ کرو' قدموں میں دولت کے انبار لگا دیئے جائیں گے' کہیں شادی کرنے کی خواہش ہو تو صرف اشارہ کرنے کی ضرورت ہو گی' جس گھرانے میں کہو تمہاری شادی کرا دی جائے گی' لیکن بہرحال تم اس کام سے باز آ جاؤ جس نے قریش کے اندر تفرقہ برپا کر دیا ہے۔ اس کا جو جواب دیا محمد رسول اللہ ﷺ نے وہ تاریخ عزیمت میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ فرمایا :

"اگر تم لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور ایک ہاتھ میں چاند رکھ دو تب بھی میں اس کام سے باز نہیں آ سکتا جس پر میں اپنے رب کی جانب سے مامور ہوا ہوں۔"

نتیجہ یہ نکلا کہ وہ وقت بھی آیا کہ آخری الٹی میٹم دیا گیا۔ ایک وفد ابو طالب کے پاس

آتا ہے جو حضور ﷺ کی پشت پناہی کیے چلے جا رہے ہیں اور انہی کی وساطت سے بنو ہاشم کا پورا خاندان گویا نبی اکرم ﷺ کی پشت پر تھا۔ قریش کی طرف سے انہیں الٹی میٹم ملتا ہے کہ اے ابو طالب! ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اب دو ہی راستے ہیں: یا محمد (ﷺ) کی حمایت سے دست کش ہو جاؤ اور یا پھر میدان میں آؤ اور مقابلہ کرو۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ ابو طالب کی ہمت بھی جواب دے گئی۔ انہوں نے حضور ﷺ کو بلایا اور یہ کہا کہ بھتیجے مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ جسے میں برداشت نہ کر سکوں۔ اور یہی وہ واحد موقع نظر آتا ہے جب حضور ﷺ کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ تاہم آپؐ نے بات وہی کہی جو عزیمت کا تقاضا تھا۔ فرمایا:

"چچا جان! اب یا تو یہ کام پورا ہو کر رہے گا جو میرے رب کی طرف سے میرے حوالے کیا گیا ہے، اور یا میں اسی میں اپنے آپ کو ہلاک کر دوں گا"۔

نبی اکرم ﷺ پر ذاتی اعتبار سے بھی ایذا و آزمائش کے بہت سے مراحل آئے۔ آپ ﷺ پر دست درازی بھی ہوئی، آپؐ کے شانۂ مبارک میں راکھ بھی ڈالی گئی، آپؐ کے راستے میں کانٹے بھی بچھائے گئے، آپؐ کی گردن میں ایک چادر پھندے کی صورت میں ڈال کر، اس کو بل دے کر اس کے دونوں سروں کو کھینچا گیا کہ آپؐ کی آنکھیں ابل آئیں۔ ایسا بھی ہوا کہ آپؐ اپنے خالق کے سامنے عین کعبے کی دیوار کے سائے میں سربسجود تھے اور وہاں عقبہ بن ابی معیط نے ابو جہل کی شہ پر ایک اونٹ کی نجاست بھری اوجھڑی حضور ﷺ کے شانۂ مبارک پر رکھ دی۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ جب یہ تعدی، یہ تشدد، یہ ظلم و ستم انتہائی شدت کی صورت اختیار کرتا ہے اور پورے خاندان بنی ہاشم کو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تین سال تک ایک گھاٹی میں محصور ہو کر گویا کہ ایک طرح کی نظربندی کی صورت میں بسر کرنے پڑتے ہیں، جس کے دوران شدید ترین مقاطعہ ہے اور کھانے پینے کی کوئی چیز گھاٹی میں داخل نہیں ہونے دی جا رہی۔ اس دوران وہ وقت بھی آیا کہ بنی ہاشم کے بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کے حلق میں ڈالنے کے لئے اس کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا کہ

چمڑے کے سوکھے جوتوں کو ابال کر ان کا پانی پی لیا جائے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے ذاتی ابتلاء کا ابھی نقطۂ عروج باقی تھا جو ۱۰ نبوی میں سامنے آگیا۔ اس سال اگرچہ شعب بنی ہاشم کی اس نظربندی سے تو رہائی مل گئی لیکن اللہ کی طرف سے امتحان و ابتلاء اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئے کہ ایک ہی سال میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا بھی انتقال ہو گیا اور ابو طالب کا بھی۔ گھر میں ایک دلجوئی کرنے والی رفیقۂ حیات تھیں وہ بھی نہ رہیں اور خاندان کی پشت پناہی کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ابو طالب تھے وہ بھی اٹھ گئے۔ یہ وہ سال ہے جسے نبی اکرم ﷺ "عَامُ الْحُزْنِ" سے تعبیر فرماتے ہیں۔ یہ رنج و غم اور اندوہ کا سال ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○○

(۷)

مکی دَور: ابتلاء کی انتہاء ——— اور ہجرتِ مدینہ

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم — بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا﴾ (بنی اسرائیل : ۸۰)

"اور (اے نبیؐ!) دعا کرو کہ اے میرے پروردگار! مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال، اور اپنی طرف سے مجھے غلبہ عطا فرما اور اس کو میرا مددگار بنا دے۔"

نبوّت کے دسویں سال حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور ابو طالب کے انتقال کے بعد سردارانِ قریش کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور دار النّدوہ میں نبی اکرم ﷺ کے قتل کے مشورے شروع ہو گئے۔ چنانچہ آنحضور ﷺ نے فطری طور پر اِدھر اُدھر دیکھا کہ مکّے کے سوا کوئی اور جگہ کون سی ہو سکتی ہے جسے آپؐ اپنی دعوت کے لئے مرکز اور Base کی حیثیت سے استعمال کر سکیں۔ مکّے سے قریب ترین طائف ہے۔ چنانچہ ایک اُمید لے کر نبی اکرم ﷺ نے طائف کا سفر اختیار کیا۔ یہ سفر انتہائی کسمپرسی کے عالم میں ہوا ہے۔ اس میں حضور ﷺ کے ساتھ وہ بھی موجود نہیں جو پوری زندگی سائے کی طرح ساتھ رہے، یعنی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ۔ آپؐ کی رفاقت میں صرف آپؐ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ پھر عام راستہ چھوڑ کر انتہائی دشوار گزار راستہ اختیار کیا گیا، اس لئے کہ اندیشہ تھا کہ کہیں مشرکینِ مکّہ سے مڈھ بھیڑ نہ ہو۔

آپ ﷺ طائف پہنچے اور وہاں کے تین سرداروں سے ملاقات کی، اس خیال سے کہ اللہ تعالیٰ اگر اُن میں سے کسی کو ایمان لانے کی توفیق عطا فرما دے تو کیا عجب کہ

طائف کا یہ شہر اس انقلابی دعوت کا مرکز اور Base بن جائے۔ لیکن جو صورت حال سامنے آتی ہے وہ واقعہ یہ ہے کہ بیان کرتے ہوئے بھی دل شق ہوتا ہے اور سننے کے لئے بھی بڑے جگر کی ضرورت ہے۔ تینوں نے اس قدر تمسخر آمیز اور تحقیر آمیز انداز اختیار کیا کہ پچھلے پورے دس سال کے دوران محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایسا معاملہ کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ نقلِ کفر کفر نہ باشد' کسی کہنے والے نے یہ کہا کہ اگر اللہ نے تمہیں رسول بنا کر بھیجا ہے تو وہ گویا خود کعبے کے پردے چاک کر رہا ہے۔ کسی نے کہا کہ میں تم سے بات بھی کرنے کے لئے تیار نہیں' اس لئے کہ اگر تم سچے ہو اور واقعتاً رسول ہو تو ہو سکتا ہے کہ میں کہیں توہین کا مرتکب ہو جاؤں اور میں عذاب خداوندی کا نوالہ بن جاؤں' اور اگر تم جھوٹے ہو تو جھوٹے اس قابل نہیں ہوتے کہ انہیں منہ لگایا جائے۔ کسی نے بڑے ہی تمسخر اور تحقیر کے ساتھ کہا کہ کیا اللہ کو تمہارے سوا کوئی اور شخص نبوت و رسالت کے لئے نہیں ملتا تھا؟ اور صرف اسی پر اکتفا نہیں' جب حضور ﷺ بظاہر احوال مایوس ہو کر لوٹنے لگے تو انہوں نے کچھ غنڈوں کو اشارہ کر دیا۔ چنانچہ اوباش لوگ حضور ﷺ کے گرد ہو گئے۔ پھر وہ نقشہ جما ہے اس کرۂ ارضی پر کہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں' محبوبِ ربّ العالمین' سید الاولین والآخرین' اور آپؐ کے گرد کچھ اوباش لوگ ہیں' جو پتھراؤ کر رہے ہیں۔ تاک تاک کر ٹخنے کی ہڈیوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے' تالیاں پیٹی جا رہی ہیں' حضور ﷺ کا جسمِ مبارک لہولہان ہو گیا ہے' نعلین مبارک خون سے بھر گئی ہیں۔ ایک موقع پر حضور ﷺ ضعف کی وجہ سے ذرا بیٹھ گئے تو دو غنڈے آگے بڑھتے ہیں' ایک ایک بغل میں ہاتھ ڈالتا ہے' دوسرا دوسری بغل میں اور اٹھا کر کھڑا کر دیتے ہیں کہ چلو۔ محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر ذاتی اعتبار سے ابتلاء اور امتحان کا نقطۂ عروج (Climax) ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ جب واپس آئے تو وہ دعا آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے نکلی ہے جس کو پڑھتے ہوئے کلیجہ شق ہوتا ہے۔

اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی -

الناس

"اے اللہ! کہاں جاؤں، کہاں فریاد کروں؟ تیری ہی جناب میں فریاد لے کر آیا ہوں۔) تجھی سے شکوہ کرتا ہوں اپنی قوت کی کمزوری کا، اپنے ذرائع و وسائل کی کمی کا اور لوگوں میں جو بے رسوائی ہو رہی ہے اس کا۔"

إلى من تكلني؟ إلى بعيد يتجهمني أو إلى عدو ملكته أمري؟

"اے اللہ! تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا تو نے میرا معاملہ دشمنوں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ جو چاہیں میرے ساتھ کر گزریں؟"

لیکن اس کے ساتھ ہی بارگاہ خداوندی میں وہ عبد کامل عرض کرتا ہے:

إن لم يكن بك علي غضب فلا أبالي

"(پروردگار! اگر تیری رضا یہی ہے) اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو پھر مجھے کوئی پروا نہیں۔"

ع سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے!

أعوذ بنور وجهك الذي أشرقت له الظلمات

"پروردگار! میں تیرے ہی روئے انور کی ضیاء کی پناہ میں آتا ہوں۔"

یہ ہے وہ دعا جس کے بارے میں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ: ع اجابت از در حق بہر استقبال می آید

چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ فوراً ملک الجبال حاضر ہوتا ہے، وہ فرشتہ کہ جو پہاڑوں پر مامور ہے، اور عرض کرتا ہے کہ حضور! اللہ نے مجھے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ آپ حکم دیں تو میں ان پہاڑوں کو ٹکرا دوں جن کے مابین وادی میں یہ طائف کا شہر واقع ہے، تاکہ اس کے رہنے والے پس کر سرمہ بن جائیں۔ اس پر رحمۃ للعالمین ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ "میں لوگوں کے عذاب کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ اگرچہ یہ لوگ مجھ پر ایمان نہیں لا رہے، لیکن کیا عجب کہ ان کی آئندہ نسلوں کو

تربیت وتزکیہ کا مرکز و محور قرآن حکیم ہی تھا۔ چنانچہ ؏ قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند! قرعہ فال نکلا حضرت مصعب بن عمیر ؓ کے نام۔ حضور ﷺ انہیں مدینہ منورہ بھیجتے ہیں۔ وہ حضرت سعد بن زرارہ ؓ کے گھر پر جا کر قیام کرتے ہیں اور مدینہ منورہ میں شب و روز دعوتِ قرآنی کو پھیلا رہے ہیں۔

حضرت مصعب بن عمیر اپنی ایک سال کی محنت کا حاصل ۱۲ نبوی میں ۷۵ افراد کو لا کر محمد رسول اللہ ﷺ کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں، جن میں ۷۲ مرد ہیں اور تین عورتیں۔ بیعتِ عقبہ ثانیہ ہوتی ہے، جو تمہید ہے ہجرت کی۔ اس موقع پر کچھ تقاریر بھی ہوئی ہیں۔ حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے، انہوں نے انصارِ مدینہ سے مخاطب ہو کر کہا کہ لوگو! اس بات کو جان لو کہ محمد (ﷺ) ہمیں بہت عزیز ہیں، ہمارے لئے انتہائی محترم ہیں، ہماری آنکھوں کا تارا ہیں، اب تک ہم نے ان کی پوری حفاظت کی ہے (چونکہ بنی ہاشم نے نبی اکرم ﷺ کی حمایت جاری رکھی تھی) اب اگر تم انہیں اپنے ہاں لے کر جانا چاہتے ہو تو جان لو کہ تمہیں ان کی حفاظت اپنے اہل و عیال سے بڑھ کر کرنی ہو گی، اور اگر اس کی ہمت نہیں پاتے تو ابھی جواب دے دو۔ لیکن انصارِ مدینہ یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ہم اپنا تن من دھن نچھاور کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ اگر حضور ﷺ ہمارے ساتھ مدینے تشریف لے جائیں تو ہم ان کی اسی طرح حفاظت کریں گے جیسے کہ اپنے اہل و عیال کی کیا کرتے ہیں۔ اس وقت وہی حضرت سعد بن زرارہ ؓ کھڑے ہوتے ہیں اور وہ بھی انصارِ مدینہ کو متنبہ کرتے ہیں کہ لوگو! اچھی طرح سمجھ لو کہ ایک بہت بڑی ذمہ داری قبول کر رہے ہو۔ محمد (ﷺ) کو دعوت دینا اور ساتھ لے کر جانا سرخ و سیاہ آندھیوں کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ معلوم ہوا کہ جو کچھ ہوا وہ اندھیرے میں نہیں ہوا، پوری طرح سمجھ کر ہوا، پوری حقیقت کو جاننے کے ساتھ ہوا، جو ذمہ داری انصارِ مدینہ نے سنبھالی اور اٹھائی اس کو پورے طور پر سمجھ کر، اس کے نتائج و عواقب پر نگاہ رکھ کر اٹھائی۔ بہرحال ۱۲ نبوی میں جو بیعتِ عقبہ ثانیہ ہوئی یہ ہجرت کی تمہید بن گئی۔

نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو عام اجازت دے دی کہ مدینے کی طرف ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ بہت سے لوگ ہجرت کر گئے۔ لیکن یہ قاعدہ ہے کہ رسول اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا' وہ اپنے مستقر کو نہیں چھوڑ سکتا جب تک کہ اللہ کی طرف سے واضح اجازت نہ آجائے ــــــ بالآخر وہ وقت آیا کہ اجازت آگئی اور نبی اکرم ﷺ اپنے اسی انتہائی گہرے دوست حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جو یارِ غار اور رفیق راہ ہیں' کی معیت میں مکے سے ہجرت فرما کر مدینے کی طرف روانہ ہوئے۔ زبانِ مبارک پر وہ دعا تھی جو سورۂ بنی اسرائیل میں گویا کہ اسی ہجرت کی تمہید کے طور پر آپ کو تلقین فرما دی گئی تھی :

﴿ رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ۝ ﴾ (بنی اسراءیل : ۸۰)

"پروردگار! مجھے جہاں داخل فرما رہا ہے وہ صدق و صداقت اور راستی کا داخلہ ہو' اور جہاں سے تو مجھے نکال رہا ہے وہاں سے میرا یہ نکلنا بھی راست بازی اور صدق پر مبنی ہو۔ اور اے ربّ! مجھے اپنے خاص خزانۂ فضل سے وہ غلبہ اور قوت و اقتدار عطا فرما جو اس مشن میں میرا مدد و معاون ہو جو تُو نے میرے حوالے کیا ہے۔"

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور آنحضور ﷺ تین روز تک غارِ ثور میں چھپے رہے۔ اس دوران وہ مرحلہ بھی آیا کہ کھوجی بالکل غار کے دہانے تک پہنچ گئے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے لئے نہیں نبی اکرم ﷺ کی طرف سے اندیشہ ناک ہو کر گھبرائے ہوئے یہ عرض کرتے ہیں کہ حضور! اگر ان میں سے کسی نے غیر ارادی طور پر بھی اپنے قدموں کی طرف نگاہ ڈال لی تو ہم دیکھ لئے جائیں گے' ہم پکڑے جائیں گے' لیکن وہ کوہِ صبر و ثبات و استقامت (ﷺ) جس کو اللہ کی ذات پر یقین کامل حاصل تھا' معیت خداوندی جس کی قوت کا اصل راز تھی' وہ فرماتا ہے :

﴿ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ﴾

"گھبراؤ نہیں (کسی رنج و غم کا کوئی موقع نہیں ہے) اللہ ہمارے ساتھ ہے۔"

(وہ ہمارا رفیق اور ہمارا مددگار ہے۔)

بہرحال یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ ہجرت مدینہ کے نتیجے میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد ایک بالکل نئے دور میں داخل ہو گئی۔ اگر جدید انقلابی اصطلاحات کا استعمال کیا جائے تو Passive Resistance کا دور ختم ہوا، اب ایک Active Resistance کا دور شروع ہو رہا ہے۔ اب تک حکم تھا کہ ہاتھ بندھے رکھو، ماریں کھاؤ، لیکن جھیلو، صبر کرو اور برداشت کرو، retaliate کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ان کو حکم دیا گیا تھا: ﴿كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ﴾ اپنے ہاتھ بندھے رکھو۔ تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا جائے تو پھر بھی تمہیں اجازت نہیں کہ مدافعت میں بھی اپنا ہاتھ اٹھا سکو، تمہیں ہلاک کر دیا جائے، شہید کر دیا جائے، تمہیں اجازت نہیں کہ اپنی مدافعت میں ہاتھ اٹھا سکو۔ لیکن اب وہ ہاتھ کھول دیئے گئے۔

سورۃ الحج کی یہ آیت مبارکہ اس مرحلہ پر نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے:

﴿ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴾

"اجازت دے دی گئی ان کو جن پر جنگ ٹھونس دی گئی ہے، اس لئے کہ ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے ہیں۔ (ان کے لئے آج سے اجازت ہے کہ وہ بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیں۔ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کا وعدہ ہے) اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔"

﴿ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ ﴾

"وہ لوگ اپنے گھروں سے ناجائز نکالے گئے، صرف اس وجہ سے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے"۔

ان کا جرم اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہوں نے خدائے واحد پر ایمان لانے کا اعلان کیا۔ آج ان کو اجازت دی جا رہی ہے کہ وہ بھی نہ صرف مدافعت میں ہاتھ اٹھائیں بلکہ کفر کے استیصال کے لئے اقدام کریں ___ بَارَكَ اللّٰهُ لِي وَلَكُمْ فِي الْقُرْآنِ الْعَظِيمِ

فَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالَىٰ عَلَىٰ خَيْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَعَلَىٰ آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ

(۷)

اندرونِ عرب انقلابِ محمدیؐ کی تکمیل

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ ﴾

(الانفال: ۳۹)

"اور ان (کافروں) سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے"۔

دارالہجرت یعنی مدینہ منورہ میں نبی اکرم ﷺ کے ورودِ مسعود کی تاریخ ۸ ربیع الاوّل سن ۱۳ نبوی ہے‘ جو سن عیسوی کے مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء قرار پاتی ہے۔ یہ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے کہ ہجرت کے نتیجے میں نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کرام ؓ کو کوئی گوشہ عافیت میسر آگیا تھا۔ واقعہ اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ ہجرت کے بعد سے نبی اکرم ﷺ کی جدوجہد شدید تر مراحل میں داخل ہوئی۔ آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے (ہجرت کے بعد کے) دس سال میں ایک بھرپور‘ ہمہ جہتی اور مکمل انقلابی جدوجہد اپنے تمام اطراف وجوانب اور تقاضوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔ چنانچہ مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد آپؐ کی جدوجہد کے تین اہم گوشے ہماری نگاہوں کے سامنے آتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ کہ آپ ﷺ کا مثبت کام جو قرآن حکیم کی اس آیت میں واضح کیا گیا کہ :

﴿ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾

اس کے حدود وسیع تر ہو گئے۔ چنانچہ ایک جانب ایک آزاد مسلمان معاشرہ جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرما دیا اُس کی تطہیرِ افکار اور تعمیرِ کردار کا فریضہ منصبی ہے جو

بجائے خود ایک سخت مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ دوسری طرف آپؐ کی دعوت و تبلیغ کی حدود کی توسیع ہے جس کے نتیجے میں ایک نئی ضرورت سامنے آئی کہ ایسے لوگوں کی ایک جماعت تیار کی جائے جو نبی اکرم ﷺ کی صحبت سے اس درجے فیض یافتہ ہوں اور تعلیم و تربیت نبویؐ سے اس درجہ حصہ پا چکے ہوں کہ پھر انہیں عرب کے اطراف و جوانب میں پیغامِ محمدی ﷺ کی نشر و اشاعت کے لئے بھیجا جا سکے۔

چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان دونوں کاموں کے لئے حضور ﷺ نے مدینہ منورہ تشریف لاتے ہی سب سے پہلے قبا میں مسجد تعمیر فرمائی اور پھر مدینے کے مرکز میں مسجدِ نبویؐ کی تعمیر کا آغاز فرمایا۔ یہ گویا کہ عملی تفسیر ہے اس آیہ مبارکہ کی جو سورۃ الحج میں اذنِ قتال والی آیت کے فوراً بعد آتی ہے کہ :

﴿ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ (الحج : ۴۱)

"یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے"۔

گویا یہ وہ فرضِ منصبی ہے کہ جس کی جانب محمدؐ رسول اللہ ﷺ ہمہ تن متوجہ ہو گئے۔

دوسری جانب مدینہ منورہ میں جو ایک آزاد مسلمان حکومت قائم ہوئی جو ابتداءً تو ایک چھوٹی سی شہری ریاست تھی، لیکن جسے حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہی کے دوران عرب کے اطراف و جوانب تک وسیع ہونا تھا اور جسے آئندہ ایک اسلامی ریاست کے لئے پیش خیمہ اور نمونہ بننا تھا، اس کے ضمن میں واقعہ یہ ہے کہ نبیّ اکرم ﷺ کے تدبّر اور حسنِ تدبیر، معاملہ فہمی، پیش بینی اور آپؐ کے حُسنِ انتظام کے جو مظاہر سامنے آتے ہیں آنجناب ﷺ کے تمام سیرت نگار خواہ وہ آپؐ کے ماننے والے ہوں یا آپؐ کی رسالت کے منکر ہوں اور یہ انکار دشمنی کی حدود تک پہنچ گیا ہو، سب نے اس کا اعتراف کیا ہے اور کھلے دل کے ساتھ کیا ہے۔ چنانچہ منٹگمری واٹ نبیّ اکرم ﷺ کے حسنِ تدبیر کو جن شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کرتا ہے شاید ہی

نسلِ آدم کے کسی اور شخص کے لئے ان الفاظ کو استعمال کیا گیا ہو۔ اس ضمن میں نبیؐ اکرم ﷺ نے کمالِ حسنِ تدبیر سے کام لیتے ہوئے سب سے پہلے یہود کے تینوں قبیلوں سے معاہدے کر لئے اور انہیں اُس قول و قرار میں جکڑ لیا جس کی بنا پر وہ کبھی نبیؐ اکرم ﷺ کی مخالفت سامنے آ کر نہ کر سکے۔

ایک دوسرا عنصر جو مدینہ منورہ کی چھوٹی سی اسلامی ریاست اور چھوٹے سے اسلامی معاشرے میں یہود کے زیر اثر پروان چڑھ رہا تھا' وہ منافقین کا گروہ تھا' جو ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتا۔ یہ مارِ آستین تھے جو اندر سے حملے کرتے تھے۔ نبیؐ اکرم ﷺ ایک طرف اپنے مثبت کام میں مصروف ہیں جو دعوت اور تعلیم و تزکیہ کا کام ہے' دوسری طرف مدینہ ہی کے اندر یہود اور منافقین کی سازشوں سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں اور تیسری طرف ہے آپؐ کا اصل محاذ جس کی جانب ارشاد ہوا سورۃ الانفال کی اس آیہ مبارکہ میں:

﴿ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ﴾

جزیرہ نمائے عرب میں اللہ کے دین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے ضروری تھا کہ اب آں حضرت ﷺ کی جانب سے بھی اقدام ہو۔ قتال کا مرحلہ شروع ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے قریش حملہ آور ہوتے ہیں اور ۲ ہجری میں ایک ہزار کا لشکرِ جرار آتا ہے۔ نبیؐ اکرم ﷺ مجلسِ مشاورت منعقد فرماتے ہیں کہ ایک طرف تو شام سے قافلہ آ رہا ہے جو مالِ تجارت سے لدا پھندا ہے اور اس کی حفاظت کے لئے صرف ۱۵۰ اشخاص ہیں' دوسری طرف ایک لشکر ہے جو مکہ سے چلا آ رہا ہے' اب لوگو مشورہ دو کہ ہمیں کدھر کا قصد کرنا چاہئے؟ یہ اصل میں آپؐ نے ایک انتہائی ماہر سپہ سالار کی حیثیت سے اپنے ساتھیوں کے حوصلے (morale) کا اندازہ کرنے کی تدبیر فرمائی تھی۔

بعض حضرات نے بر بنائے طبع بشری اس خیال کا اظہار کیا کہ ہمیں پہلے قافلے کا رُخ اختیار کرنا چاہئے' لیکن صحابہ کرام ؓ میں سے وہ لوگ جو نبیؐ اکرم ﷺ کے

مزاج شناس تھے انہوں نے یہ بھانپ لیا کہ حضور ﷺ کا قصد کدھر ہے۔ چنانچہ جاں نثاروں کی تقریریں ہوئیں۔ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضور! ہمیں آپ اصحاب موسیٰ پر قیاس نہ فرمائیں جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کورا جواب دے دیا تھا کہ :

﴿ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۝ ﴾

(المائدۃ : ۲۴)

"پس آپ اور آپ کا رب جاکر جنگ کریں ' ہم تو یہاں بیٹھے ہیں"۔

آپ اللہ کا نام لے کر جدھر بھی آپ کا قصد ہو ارشاد فرمائیں 'کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمارے ذریعے سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما دے۔ حضور ﷺ کو خاص طور پر انصار کی طرف سے رائے کا انتظار تھا۔ چنانچہ اس کو بھانپ کر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ رئیس خزرج کھڑے ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ حضور! اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ ہم آپ پر ایمان لاچکے ہیں 'ہم نے آپ کی تصدیق کی ہے 'اب ہمارے لئے کون سا اختیار رہ گیا ہے۔ آپ ﷺ جدھر کا بھی ارادہ ہو بسم اللہ کیجئے 'اگر آپ برک الغماد تک جانے کا حکم دیں تو ہم جائیں گے اور ان شاء اللہ ہم اس سے گریز نہ کریں گے۔ آپ ہمیں سمندر میں چھلانگ لگانے کے لئے فرمائیں تو ہم دریغ نہیں کریں گے۔ یہ تھے جاں نثارانِ محمد ﷺ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

بدر کے میدان میں جنگ ہوئی۔ ایک جانب ۳۱۳ افراد پر مشتمل بے سرو سامان اسلامی لشکر تھا جس کے ساتھ صرف دو گھوڑوں پر مشتمل رسالہ تھا اور دوسری جانب ایک ہزار کا غرقِ آہن لشکر جرار تھا۔ لیکن اللہ نے لشکر اسلام کو فتح عطا فرمائی اور اس دن کو "یوم الفرقان" بنا دیا۔ یعنی یہ فیصلے کا دن ہے! آج معلوم ہو گیا کہ صداقت کس کے ساتھ ہے 'اللہ کی حمایت کسے حاصل ہے! لیکن یہ فتح جو بدر میں اللہ نے عطا فرمائی اگلے ہی سال ایک دوسرے امتحان کی تمہید بن گئی۔

۳ ہجری میں قریش نے پھر حملہ کیا۔ اس مرتبہ تین ہزار کا لشکر جرار آیا اور اس

بار مسلمانوں کو اپنی جماعت کے متعلق پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس میں سب ہی مؤمنین صادقین نہیں ہیں بلکہ بار آستین بھی اب ایک اچھی خاصی تعداد میں شامل ہو چکے ہیں جنہیں منافقین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے' جنہوں نے بروقت دغا دی اور عبداللہ بن ابی کل ایک ہزار کے لشکر میں سے ۳۰۰ افراد کو لے کر واپس مدینے لوٹ گیا۔ یہ جنگ جو دامنِ اُحد میں لڑی گئی اللہ تعالیٰ نے اس کو اہلِ ایمان کے لئے ابتلاء و آزمائش اور ان کی تربیت اور تزکیہ کا ایک بہت بڑا ذریعہ بنا دیا۔ اس میں مسلمانوں کو اپنی ایک غلطی کی وجہ سے ابتداءً کسی قدر شکست سے بھی دوچار ہونا پڑا' لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے کمالِ فضل سے بالآخر مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔

دو سال بعد غزوۂ احزاب ہوتا ہے' جو غزوۂ خندق بھی کہلاتا ہے۔ اب بارہ ہزار کا لشکرِ جرار مدینہ منورہ پر حملہ آور ہے۔ بعض روایات میں تعداد اس سے بھی زائد آئی ہے۔ محاصرہ ہوا۔ حضرت سلمان فارسی بڑتھ کے مشورے سے حضور ﷺ نے محصور ہو کر اور خندق کھود کر دفاع کرنے کی تجویز پر عمل کیا۔ یہ غزوہ اہلِ ایمان کے لئے بہت بڑا امتحان ثابت ہوا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کُفّار کے لشکر کی صورت میں جو آندھیاں آئی تھیں وہ اللہ کی بھیجی ہوئی آندھیوں سے ختم بھی ہو گئیں' لیکن اس کے دوران اہلِ ایمان کا بڑا امتحان ہو گیا' اور اہلِ نفاق کا نفاق بھی پورے طور پر عیاں اور ظاہر ہو گیا۔ غزوۂ خندق میں جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیابی عطا فرمائی تو حضور ﷺ نے جن کا دستِ راست حالات کی نبض پر تھا' مسلمانوں کو یہ خبر دی تھی کہ یہ آخری بار ہے کہ قریش تم پر چڑھ آئے تھے۔ فرمایا:

((لَنْ تَغْزُوَكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ))

"اس سال کے بعد قریش تم پر ہرگز حملہ آور نہیں ہوں گے' بلکہ تم ان پر حملہ آور ہو گے"۔

اب اقدام (initiative) تمہارے ہاتھوں ہو گا' اب پیش قدمی تم کرو گے۔ چنانچہ ۶ ہجری میں اپنے ایک خواب سے بشارت پا کر' اور یہ معلوم رہے کہ نبی کا خواب

بھی وحی ہوتا ہے' نبی اکرم ﷺ نے عمرے کی نیت سے مکہ مکرمہ کا سفر کیا جس کے نتیجے میں صلح حدیبیہ واقع ہوئی۔ اگرچہ اس سال حضور ﷺ عمرہ نہ کر سکے' وہ دوسرے سال ہوا' لیکن اس صلح حدیبیہ کو اللہ تعالیٰ نے فتح عظیم قرار دیا :

﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ﴾

حدیبیہ میں بظاہر احوال آنحضور ﷺ نے کچھ دب کر صلح کی تھی' لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ حضور ﷺ کے تدبر کا شاہکار ہے جس کی توثیق وحی آسمانی نے کی کہ یہ فتح مبین ہے۔ اس لئے کہ اس کے بعد حضور ﷺ کو دو سال کا عرصہ ایسا ملا کہ جس میں گویا کہ قریش کے ہاتھ بندھ گئے تھے۔ اب میدان میں کوئی مزاحمت نہ تھی۔ ایک طرف تو اس صلح نے پورے عرب کے سامنے یہ بات روشن کر دی کہ قریش نے محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو تسلیم کر لیا ہے۔ یہ گویا کہ ایک طرح کی recognition تھی۔ گویا مان لیا گیا تھا کہ اب آنحضور ﷺ اور مسلمان ایک طاقت ہیں (They are a power to reckon with) اب ان کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ چنانچہ پورے عرب میں آنحضور ﷺ کی دھاک بیٹھ گئی۔ دوسرے قریش کے ہاتھ بندھ گئے اور حضور ﷺ کے ہاتھ پوری طرح کھل گئے۔ آپؐ کا دعوتی اور تبلیغی سلسلہ پورے دو سال کے دوران اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ اصحابِ صُفّہ کی وہ جماعت جو تعلیم و تربیتِ نبویؐ سے تیار ہو رہی تھی اس کو بکثرت وفود کی شکل میں تبلیغ کے لئے عرب کے کونے کونے میں بھیجا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دعوتِ محمدیؐ جنگل کی آگ کی طرح پورے عرب میں پھیل گئی۔

اس صورتِ حال کو دیکھ کر اور کچھ قریش نے خود اپنی غلطی کو محسوس کرتے ہوئے ایک عاجلانہ اقدام کے ذریعے صلح کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد ان کے مدبر رہنما ابوسفیان جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے' انہوں نے حالات کے رخ کو پہچان کر پوری کوشش کی کہ اس صلح کی تجدید ہو جائے' لیکن نبی اکرم ﷺ کا دستِ مبارک جس طرح حالات کی نبض کو ٹٹول رہا تھا اس سے یہ بات آپؐ کے سامنے

بالکل عیاں تھی کہ اب کسی صلح کا دوبارہ کرنا گویا کفر اور شرک کو ایک تازہ مہلتِ زندگی (fresh lease of existence) دینا ہے۔ لہٰذا آپؐ نے صلح کی اس کوشش کو قبول نہیں فرمایا اور آپؐ نے ۸ ہجری میں دس ہزار جان نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی معیت میں مکّے کی طرف پیش قدمی کی اور اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک فاتح کی حیثیت سے اس شہر میں کل آٹھ سالوں کے اندر اندر داخل کر دیا جہاں سے آٹھ سال قبل آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جان بمشکل بچا کر نکل سکے تھے۔ ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾

فتح مکہ کے فوراً بعد طائف کے قبائل کی طرف سے ایک آخری کوشش ہوئی۔ اس کو یہ سمجھا جانا چاہئے کہ عرب میں کفر اور شرک کی طرف سے یہ آخری ہچکی تھی۔ غزوۂ حنین کی شکل میں یہ مقابلہ ہوا۔ ابتداءً وہاں مسلمانوں کو اپنی کثرتِ تعداد کے پیش نظر جو کچھ زعم ہو گیا تھا اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں کچھ سبق پڑھانے کے لئے شکست سے دوچار کیا' لیکن بالآخر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت نے رُخ پھیر دیا جو اُس وقت انتہائی شان کے ساتھ اس طرح ظاہر ہوئی کہ آپؐ اپنی سواری سے اترے' آپؐ نے علم اپنے ہاتھ میں لیا اور یہ رجز پڑھا۔

أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ — أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ

اللہ تعالیٰ نے پھر فتح عطا فرمائی۔ یہ گویا کہ پورے جزیرہ نمائے عرب پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فیصلہ کن فتح تھی۔

چنانچہ یہی ہے وہ عمل کہ جس کے نتیجے میں اظہارِ دینِ حق جزیرہ نمائے عرب کی حد تک پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا اور محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد ملکِ عرب کی حد تک مکمل ہو گیا۔

فَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا

(۸)

انقلابِ نبویؐ کے بین الاقوامی مرحلے کا آغاز

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿ وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا ... ﴾

(سبا : ۲۸)

خاتم النبیین اور آخر المرسلین ہونے کی حیثیت سے آں حضور ﷺ پر نبوت و رسالت کا صرف اختتام ہی نہیں ہوا بلکہ اِتمام و اِکمال بھی ہوا ہے۔ نبی اکرم ﷺ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے۔ ایک بعثت خصوصی اہلِ عرب کی جانب اور ایک بعثت عمومی پوری نوعِ انسانی کی طرف۔ اگرچہ نظری طور پر تو یہ بھی ممکن تھا کہ آنحضور ﷺ اپنی ان دونوں بعثتوں کے ضمن میں اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی کا آغاز بیک وقت فرما دیتے' یعنی جیسے ہی آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں اپنی رسالت کا دعویٰ ظاہر فرمایا اسی وقت آپؐ امراء و سلاطین کے نام بھی خطوط ارسال فرما دیتے' لیکن آپؐ نے اپنی دعوت و تبلیغ میں جس حکمت اور جس تدریج کو پیش نظر رکھا اس کا یہ نتیجہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ ۶ھ تک جبکہ صلح حدیبیہ واقع ہوئی اور گویا کہ اہلِ عرب نے نبی اکرم ﷺ کی قوت کو تسلیم کر لیا' آنحضور ﷺ نے اپنی تمام تر توجہات اندرونِ ملک عرب مرتکز رکھیں اور بیرونِ ملک عرب اپنی کسی دعوتی کوشش کا آغاز نہیں فرمایا۔ البتہ صلح حدیبیہ کے بعد آپؐ نے دعوتی نامہ ہائے مبارک ارسال فرمائے قیصرِ روم کے نام بھی' کسریٰ فارس کے نام بھی اور آس پاس کی دوسری چھوٹی حکومتوں جیسے مقوقس شاہِ مصر' نجاشی شاہِ حبشہ' رؤسائے یمامہ اور رؤسائے شام کے نام بھی۔

یہ بات واضح رہے کہ روم اور فارس کو اس وقت کی دو سپر پاورز کی حیثیت

حاصل تھی ـــــ آنحضور ﷺ کی اصل اہم سفارتیں انہی دو سلطنتوں کی طرف ارسال ہوئیں۔ حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ قیصرِ روم کے دربار میں اور حضرت عبداللہ ابن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کسریٰ کے دربار میں بھیجے گئے۔ قیصر اور کسریٰ کا طرزِ عمل ایک دوسرے سے بالکل متضاد سامنے آیا۔ قیصر عیسائی تھا' صاحبِ علم تھا' وہ جانتا تھا کہ نبی آخر الزمان کے ظہور کا وقت قریب ہے۔ اس نے نامہ مبارک کی بھی قدر کی اور آپ ﷺ کے سفیر کی بھی عزت افزائی کی۔ بلکہ ہمیں تاریخ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ایک بھرپور کوشش کی کہ کسی طرح پوری سلطنت اسی طرح اسلام کو قبول کرلے جیسے ماضی میں پوری سلطنتِ روما نے عیسائیت کو اختیار کیا تھا' تاکہ اس کی بادشاہت اور حکومت کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ لیکن افسوس وہ اس میں ناکام رہا اور یہی بادشاہت' سیادت اور دُنیوی اقتدار اس کے پاؤں کی بیڑی ثابت ہوا اور وہ دولتِ ایمان سے محروم رہ گیا۔ اس کے برعکس رویہ سامنے آیا کسریٰ کا' اس نے نامہ مبارک چاک کر دیا اور نہایت غیظ و غضب کے عالم میں اپنے یمن کے گورنر باذان کو یہ حکم بھیجا کہ محمد (ﷺ) کو گرفتار کر کے ہمارے دربار میں پیش کیا جائے۔ حضور ﷺ نے اس پر تبصرہ فرمایا کہ "کسریٰ نے میرا خط چاک نہیں کیا بلکہ اپنی سلطنت کے پرزے کر دیئے ہیں"۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ کے دور میں یہ پیشین گوئی فی الواقع پوری ہوئی۔ اسی طرح مقوقس شاہِ مصر کی طرف سے بھی ہرقل قیصرِ روم ہی کا سا طرزِ عمل سامنے آیا' بلکہ اس نے حضور ﷺ کے نامہ مبارک کی تکریم بھی کی اور حضور ﷺ کی خدمت میں ہدایا بھی ارسال کیے۔ نجاشی والیٔ حبشہ پہلے ہی ایمان لا چکے تھے۔ الغرض اس طرح نبی اکرم ﷺ کی دعوت و تبلیغ کا دائرہ ملک سے نکل کر اطراف و جوانب کی طرف وسعت اختیار کر گیا۔

اسی ضمن میں یہ واقعہ پیش آگیا کہ روٴسائے شام میں سے ایک شخص شرحبیل بن عمرو غسانی نے نبی اکرم ﷺ کے سفیر حضرت حارث بن عمیر ازدی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ یہ تھا وہ واقعہ جس کے نتیجے میں قصاص کے لئے نبی اکرم ﷺ نے ایک جیش

روانہ فرمایا اور یہی بات تمہید ہو گئی سلطنتِ روما کے ساتھ ایک مسلح تصادم کی۔ چنانچہ نبیؐ اکرم ﷺ نے تین ہزار کا ایک لشکر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں اس قتل کے قصاص کے لئے روانہ کیا' اُدھر سے شرحبیل بن عمرو ایک لاکھ کا لشکر لے کر چلا۔ جب حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے مجلسِ مشاورت منعقد کی۔ تین ہزار اور ایک لاکھ کے مابین ظاہر ہے کہ کسی مقابلہ کا کوئی سوال نہیں تھا! لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس بات کو سامنے رکھا کہ ہم تو اصل میں شہادت کے طلب گار ہیں' ہمارے لئے فتح یا شکست بے معنی ہے' ہمیں تو جامِ شہادت نوش کرنا ہے۔ چنانچہ موتہ کے مقام پر مقابلہ ہوا۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ حضور ﷺ کے حکم کے مطابق ان کے بعد حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے علم سنبھالا۔ وہ بھی شہید ہوئے اور اُن کے جسم پر زخموں کو گنا گیا تو نوّے (۹۰) زخم تھے۔ ان کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ انصاری رضی اللہ عنہ نے علم سنبھالا۔ وہ بھی شہید ہوئے۔ ان کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کمان سنبھالی جنہیں حضور ﷺ نے اس معرکہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو کامیابی سے دشمن کے نرغے سے بچالانے پر سَیْفٌ مِّنْ سُیُوْفِ اللّٰہِ کا خطاب عطا فرمایا۔ اگرچہ مقابلہ تو بہرحال نہیں ہو سکتا تھا اور عام معنیٰ میں فتح حاصل ہونی عقلاً محال تھی' لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کمالِ تدبیر کے ساتھ اپنے لشکر کو غنیم کے نرغے سے نکال لیا اور واپس تشریف لے آئے۔ جنگِ موتہ جو جمادی الاولیٰ ۸ھ میں ہوئی' یہ گویا کہ نبی اکرم ﷺ کی قائم کردہ اسلامی ریاست کا وقت کی ایک عظیم مملکت سلطنتِ روما کے ساتھ پہلا مسلح تصادم تھا۔

اس کے بعد کچھ خبریں ملنی شروع ہوئیں کہ رومی فوجیں جمع کر رہے ہیں اور حملے کا ارادہ رکھتے ہیں' غسان کے تمام قبائل مجتمع ہو کر مدینہ منورہ کی طرف پیش قدمی کے نقشے بنا رہے ہیں' تو نبی اکرم ﷺ نے خود اپنی طرف سے اقدام فرمانے کے لئے تمام مسلمانوں میں ایک نفیرِ عام کا اعلان کروا دیا۔ یہ وقت بڑا ہی نازک تھا۔ سلطنتِ روما کے ساتھ ٹکراؤ کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ سلطنت کہ جس کے پاس لاکھوں کی

Standing Armies موجود تھیں، جن کی فوجیں پوری طرح تربیت یافتہ اور قواعد حرب سے پورے طور پر آگاہ اور ہر طرح کے اسلحہ سے پورے طور پر مسلح تھیں، ان کے ساتھ مسلح تصادم کا مرحلہ درپیش تھا۔ چنانچہ نفیر عام ہوئی کہ ہر صاحبِ ایمان کو اس معرکے میں شرکت کے لئے نکلنا ضروری ہے۔ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں صرف اسی ایک موقع پر نفیرِ عام ہوئی ہے جسے غزوۂ تبوک یا سفرِ تبوک کا نام دیا گیا ہے جو ۹ھ میں پیش آیا۔ یہ وہ وقت ہے جب کہ شدید گرمی کا موسم تھا، ایک طویل مسافت طے کرنی تھی، سلطنتِ روما سے ٹکراؤ تھا، قحط کی کیفیت تھی، اجناس کی کمی تھی، رسد ساتھ لے جانے کے لئے موجود نہ تھی۔ اس وقت اہلِ نفاق کا نفاق پوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آیا۔ چنانچہ سورۂ توبہ میں جہاں اس وقت کے حالات پر بڑا بھرپور تبصرہ ہے، منافقین کی طرف سے اس ضمن میں جو جو کچھ کہا گیا اس کا پورا ذکر موجود ہے۔

الغرض اہلِ ایمان نے پورے صبر اور ثبات کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی پکار پر لبیک کہا۔ تیس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا لشکر لے کر نبی اکرم ﷺ نے تبوک کی طرف کوچ کیا جس میں دس ہزار کا رسالہ بھی شامل تھا۔ حضور ﷺ سرحدِ شام پر پہنچ کر تبوک کے مقام پر قیام پذیر ہوئے اور بیس دن تک وہاں قیام فرما رہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہرقل قیصرِ روم نے مقابلے سے پہلوتہی اختیار کی، اور اس کا سبب بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ علم تھا اور حضرت مسیح علیہ السلام کا نام لیوا، آسمانی کتابوں کو جاننے والا تھا۔ وہ پہچان چکا تھا کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ چنانچہ یہ بات اس کے سامنے بالکل واضح تھی کہ اللہ و رسول (ﷺ) سے مقابلہ کرنے کے معنی یقینی شکست کے ہیں، لہٰذا وہ پہلوتہی کرتا رہا، طرح دیتا رہا، مقابلے میں نہ آیا، حالانکہ اس کے پاس لاکھوں کی تعداد میں مسلح فوج موجود تھی۔

تبوک میں بیس دن قیام کے دوران آس پاس کے قبائل کے سردار اور رئیس آ کر حضور ﷺ کے ساتھ اطاعت کا عہد و پیمان کرتے رہے۔ اس طرح عرب

گی جو ایک اسلامی ریاست قائم ہوئی اسے جزیرہ نمائے عرب میں پورا استحکام حاصل ہو گیا' اس کا رعب پورے عرب پر چھا گیا اور اس کی دھاک اطراف و جوانب پر بیٹھ گئی اور نبی اکرم ﷺ بغیر کسی مسلح تصادم کے مدینہ تشریف لے آئے۔

اس کے بعد اپنے مرضِ وفات میں نبی اکرم ﷺ نے پھر ایک جیش تیار کر رکھا تھا جس کی سرکردگی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے فرزند حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو دی گئی تھی۔ یہ ہے درحقیقت تمہید اس تصادم کی جس کا آغاز نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے آخری دور میں وقت کی دو عظیم ترین سلطنتوں کے ساتھ ہو گیا تھا اور یہی بعد میں خلافتِ راشدہ کے دوران اسلامی فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

۹ ھ میں نبی اکرم ﷺ نے حج کے موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج کی حیثیت سے متعین فرما کر روانہ کیا۔ لیکن جبکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ روانہ ہو چکے تھے' سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں اور حضور ﷺ کو حکم دے دیا گیا کہ اعلانِ عام کر دیا جائے اس حج کے موقع پر تمام مشرکین کے لئے کہ عرب کے تمام وہ لوگ کہ جو شرک پر کاربند رہنا چاہیں' وہ کان کھول کر سن لیں کہ اب ان کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے کوئی معاہدہ نہیں ہے اور ان سے کامل براءت ہے۔

﴿ بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ﴾ (التوبۃ : ۱-۳)

"اعلانِ براءت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کئے تھے۔ پس تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو' اور یہ کہ اللہ منکرین حق کو رسوا کرنے والا ہے۔ اعلانِ عام ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف

سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کے لئے کہ اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے
اور اس کا رسول بھی۔"

اب ان کو آخری الٹی میٹم دیا جا رہا ہے کہ چار مہینوں کی مدت کے ختم ہونے کے فوراً بعد ان کے خلاف عام اقدام شروع کر دیا جائے گا۔ اب یا وہ اسلام قبول کر لیں اور اگر کفر اور شرک پر قائم رہنا چاہتے ہیں تو جزیرہ نمائے عرب کو خیرباد کہہ کر جہاں سینگ سمائیں چلے جائیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت علیؓ ہی یہ اعلانِ عام کرنے کے لئے تشریف لے گئے اور ۹ھ کے حج کے موقع پر یہ اعلانِ عام ان قبائل کے وفود کے سامنے کر دیا گیا جو حج کے لئے آئے ہوئے تھے۔

۱۰ھ میں آپ محمد رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع کے لئے بنفس نفیس تشریف لے جاتے ہیں۔ معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حج کے موقع پر عرب کے کونے کونے سے سوا لاکھ کے قریب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمع ہوئے۔ گویا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تیئس برس کی محنت شاقہ کا حاصل میدانِ عرفات میں جمع ہو گیا۔ اس موقع پر حضور ﷺ نے عرفات میں بھی خطبہ دیا اور منیٰ میں بھی خطبے ارشاد فرمائے۔ اور ان ہی خطبات کو یکجا کر کے خطبہ حجۃ الوداع کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس میں ایک جانب تو حضور ﷺ نے ابتداء ہی میں اپنے وصال کی خبر دے دی کہ :

"لوگو! شاید کہ دوبارہ اس مقام پر ملنا نصیب نہ ہو!"

اس کے بعد آپ ﷺ نے اپنی تعلیمات کو Finishing touches دیئے اور اہم چیزوں کا دوبارہ اعادہ کیا۔ اس کے ضمن میں آپ نے فرمایا :

"پوری نوعِ انسانی ساجی اعتبار سے بالکل برابر ہے۔ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کوئی فضیلت نہیں۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت نہیں۔"

یہ ہے وہ چیز جس کا بالخصوص ذکر کرتا ہے ایچ جی ویلز اور اعتراف کرتا ہے کہ یہ اصول جو محمد عربی (ﷺ) نے بیان فرمایا' یہ محض ایک وعظ نہیں تھا' واقعتاً محمد (ﷺ) نے ان ہی اصولوں پر ایک معاشرہ بالفعل قائم کر دیا۔

خطبے کے آخر میں اب حضور ﷺ نے لوگوں سے ایک سوال کیا:

((اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ؟)) "لوگو! میں نے پہنچا دیا یا نہیں؟"

اور مجمع عام نے بیک زبان یہ جواب دیا:

اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ

"ہاں حضورؐ! ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا' حقِ امانت ادا کر دیا' حقِ نصیحت ادا کر دیا۔"

حضور ﷺ نے تین مرتبہ سوال کیا اور تین ہی مرتبہ پورے مجمع نے یہی جواب دیا۔ اس کے بعد آپؐ نے تین مرتبہ انگشتِ شہادت سے پہلے آسمان کی طرف اور پھر لوگوں کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا:

((اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ. اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ. اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ))

"اے اللہ تو بھی گواہ رہ! اے اللہ تو بھی گواہ رہ! اے اللہ تو بھی گواہ رہ!"

یہ گویا عملی تفسیر ہے سورۃ الفتح کی اس آیت کے آخری حصے کی کہ:

﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ ﴾

"وہ (اللہ) ہی ہے جس نے اپنے رسول (ﷺ) کو الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے' تاکہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے' اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔"

اس کے بعد آپ ﷺ نے آخری بات فرمائی کہ مسلمانو! میرا کام ابھی مکمل نہیں ہوا ——— بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے!
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!!

پورے عالمِ انسانیت تک اس پیغام کو پہنچانا اب تمہارے ذمے ہے۔

((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ))

"اب چاہیئے کہ پہنچائیں وہ جو یہاں موجود ہیں اُن کو جو یہاں موجود نہیں ہیں۔"

فَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا

(۹)

انقلاب دشمن طاقتوں کا خاتمہ
خلافتِ صدّیقی

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ ط اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا ۝﴾ (النصر)

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے آخری چار سال کے دوران' یعنی صلح حدیبیہ کے بعد آنحضور ﷺ کی جدّوجہد نے واضح طور پر دو رخ اختیار کر لئے ـــــ یعنی ایک طرف آپ ﷺ کی بعثتِ خصوصی اِلٰی اَھْلِ الْعَرب کے مقاصد کی تکمیل کے ضمن میں پورے جزیرہ نمائے عرب پر اللہ کے دین کا بالفعل قیام اور نفاذ ـــــ اور دوسری طرف آپ ﷺ کی بعثتِ عمومی اِلٰی کَافَّۃِ النَّاسِ کے مقاصد کی تکمیل کے ضمن میں پیغامِ محمدی علٰی صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام کی تمام اقوام و مللِ عالم کو تبلیغ اور پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کے غلبے کے لئے سعی و جُہد کا آغاز۔

حجۃ الوداع کو اس ضمن میں ایک سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس موقع پر ایک طرف یہ بات بالکل ظاہر ہو گئی کہ اب پورے جزیرہ نمائے عرب پر اللہ کا دین فیصلہ کن طور پر غالب ہو چکا ہے اور دوسری جانب نبی اکرم ﷺ نے اپنی بعثتِ عامّہ کے فرائض کی تکمیل کے لئے ساری ذمہ داری اُمت کے حوالے فرما دی یہ حکم دے کر کہ :

((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) (متفق علیہ)

"اب پہنچائیں اس پیغام کو وہ لوگ جو یہاں موجود ہیں اُن سب لوگوں کو جو یہاں موجود نہیں ہیں۔"

حجۃ الوداع سے واپسی کے فوراً بعد ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے نبی اکرم ﷺ کی روحِ مبارک اس عالمِ ناسوت میں مزید قیام کے لئے بالکل تیار نہ ہو اور اس پر رفیقِ اعلیٰ کی جانب مراجعت کا جذبہ شدت سے غالب آچکا ہو۔ چنانچہ حج کے بعد آپؐ کی حیاتِ دُنیوی کے کل اسّی (۸۰) یا نوّے (۹۰) دن ہیں۔ اس لئے کہ مختلف روایات کی رو سے ۱۸ یا ۱۹' یا ۲۸ یا ۲۹ صفر المظفر ۱۱ھ کو نبی اکرم ﷺ کے مرضِ وفات کا آغاز ہو گیا اور ۲ یا ۳' یا ۱۲ یا ۱۳ ربیع الاوّل کو نبی اکرم ﷺ کی روحِ مبارک نے آپؐ کے جسدِ عنصری سے پرواز کر لی۔ آخری ایام میں بالکل ایسے محسوس ہوتا تھا کہ آپؐ پر اب اس دُنیا میں جو بھی لمحہ گزر رہا ہے' بڑا شاق گزر رہا ہے۔ چنانچہ اپنے مرضِ وفات کے دوران آپ ﷺ نے خطبہ بھی ارشاد فرمایا۔ جب ذرا افاقہ ہوا اور آپؐ اپنے حجرے سے برآمد ہوئے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپؐ کے حکم کے مطابق امامت فرما رہے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کی امامت میں نماز ادا فرما رہے تھے۔ حضور ﷺ تشریف لائے' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پیچھے ہٹنا چاہا' لیکن حضور ﷺ نے اشارے سے انہیں حکم دیا کہ نماز جاری رکھو' اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پہلو میں بیٹھ کر نماز ادا فرمائی اور اس کے بعد آپؐ نے خطبہ ارشاد فرمایا:

"اللہ نے اپنے ایک بندے کو یہ اختیار دیا کہ وہ چاہے تو دنیا کی نعمتیں قبول کر لے اور چاہے تو جو کچھ اُس کے پاس ہے' یعنی عالمِ اُخروی کی نعمتیں' انہیں اختیار کر لے' تو بندے نے جو کچھ رب کے پاس ہے' اسے قبول کر لیا۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ سن کر رو پڑے۔ اس لئے کہ انہیں اندازہ ہو گیا کہ درحقیقت نبی اکرم ﷺ یہ خود اپنی بات فرما رہے ہیں اور آپؐ نے ہم سے جدائی اور رفیقِ اعلیٰ کی طرف مراجعت کا فیصلہ کر لیا ہے۔

نبیؐ اکرم ﷺ کا وصال یقیناً اُمّتِ مسلمہ کے لئے بالعموم اور بالخصوص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کے لئے ایک انتہائی رنج و غم، اندوہ اور صدمے کی بات تھی، لیکن ظاہر ہے کہ نبیؐ اکرم ﷺ جو مشن اُمّت کے حوالے کر کے گئے تھے اس کی تکمیل نہایت اہمیت کی حامل تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے جو نظمِ جماعت قائم فرمایا تھا، اب اس کا ظہور ہوتا ہے۔ وہ کتنا پختہ نظمِ جماعت تھا کہ فوراً ہی مشوروں سے تمام مراحل طے پا گئے اور نبی اکرم ﷺ نے جنہیں نماز کی امامت کے لئے آگے بڑھایا تھا اور جنہوں نے حضور ﷺ کی حیات کے دوران امام بن کر مسلمانوں کو ۱۷ نمازیں پڑھائی تھیں انہی کی خلافت پر اُمّت کا اجماع ہو گیا۔ حضرت ابوبکر بلاشبہ صدّیقِ اکبر ہیں رضی اللہ عنہ۔ اور یہ جان لینا چاہئے کہ مقامِ صدّیقیت، مقامِ نبوّت سے بہت قرب رکھتا ہے، بلکہ شیخ احمد سرہندی المعروف بہ مجدد الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول تو یہ ہے کہ "حقیقتِ صدّیقی ظلِّ حقیقتِ محمدی است۔" یعنی مقامِ صدّیقی در حقیقت مقامِ نبوّت کا ظلّ اور سایہ ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ جزیرہ نمائے عرب میں جس انقلاب کی تکمیل فرما گئے تھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کل اڑھائی سالہ خلافت کے دوران اس کے از سرِ نو استحکام کا عمل تمام و کمال پورا ہوا۔

تاریخِ عالم میں جتنے انقلابات آئے ہیں ان سب میں آپ کو ایک بات قدرِ مشترک کے طور پر ملے گی کہ انقلاب جب اپنے آخری مراحل میں ہوتا ہے تو اس وقت انقلاب دشمن طاقتیں کونوں اور کھدروں میں دبک جایا کرتی ہیں اور منتظر رہتی ہیں کہ پھر جب بھی موقع ہو، وہ سر اٹھائیں اور انقلاب پر حملہ آور ہوں اور اسے ناکام کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ یہی عمل ہے جو نبیؐ اکرم ﷺ کے وصال کے فوراً بعد ہمیں جزیرہ نمائے عرب میں ہر چہار طرف نظر آتا ہے۔ ایک سماں یہ تھا کہ فرمایا گیا: ﴿وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا﴾ "(اے نبیؐ!) آپ نے دیکھ لیا کہ لوگ داخل ہو رہے ہیں اللہ کے دین میں فوج در فوج"۔ لیکن حضور ﷺ کے انتقال کے بعد عارضی طور پر منظر یہ سامنے آیا کہ "یَخْرُجُوْنَ مِنْ دِیْنِ

اللّٰہِ اَفْوَاجًا" کا سا معاملہ ہو گیا۔ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین سے نکلنے لگے۔ ایک جانب نبوت کا دعوے دار 'جھوٹے مدعیانِ نبوت کھڑے ہو گئے اور ان کی دعوت پر بھی لاکھوں کی تعداد میں لوگوں نے لبیک کہا۔ دوسری طرف ایک کثیر تعداد میں لوگ زکوٰۃ سے انکار کر کے کھڑے ہو گئے کہ ہم توحید کی گواہی دیں گے 'ہم رسالت کی گواہی دیں گے 'نماز بھی قائم کریں گے 'لیکن زکوٰۃ ادا نہیں کریں گے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بظاہر بہت رقیق القلب انسان تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا جسم بھی بہت ہی نحیف و نزار تھا' لیکن اس موقع پر یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس بظاہر کمزور شخصیت کے اندر ہمت' صبرو استقامت اور ثبات کا ایک کوہِ ہمالیہ مضمر ہے۔ چنانچہ آپؓ نے بیک وقت ان تمام فتنوں سے مقابلہ فرمایا۔ حالانکہ بہت سے حضرات نے آپؓ کو مشورہ دیا کہ کم سے کم مانعینِ زکوٰۃ کے معاملے میں حکمتِ عملی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے فی الوقت کسی قدر نرمی سے کام لیا جائے۔ لیکن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اللہ کے رسول ؐ کا جانشین ہوں۔ اَنَا خَلِیْفَۃُ رَسُوْلِ اللّٰہِ۔ اور اللہ کے رسول ﷺ ہمیں جو دین دے کر گئے ہیں اس میں اگر سرِمُو بھی فرق کرنے کی کوشش کی گئی تو اور کوئی میرا ساتھ دے یا نہ دے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) تنہا سب کا مقابلہ کرے گا۔ یہاں تک کہ آپؓ نے فرمایا کہ "یہ تو زکوٰۃ کا انکار کر رہے ہیں 'اگر ایسا بھی ہو کہ حضور ﷺ کے زمانے میں زکوٰۃ کے اونٹوں کے ساتھ ان کی رسیاں بھی آئی ہوں اور اب یہ لوگ اونٹ دینا چاہیں لیکن رسیاں نہ دینا چاہیں تو بھی میں ان سے قتال کروں گا۔"

یہ ہے وہ عزیمت اور صبرو ثبات کہ جس کا مظاہرہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا قیام ابھی اس عالمِ ناسوت میں کچھ عرصہ مزید رہتا تو بہت اچھا ہوتا۔ آپ ﷺ اپنے انقلاب کے خلاف اٹھنے والی ان تمام مخالفانہ قوتوں (Reactionary forces) کا بھی بنفسِ نفیس خود اپنے دستِ مبارک سے استیصال فرما جاتے اور انقلاب کو از خود استحکام

بخش کر پھر رفیقِ اعلیٰ کی جانب مراجعت فرماتے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حکمتِ خداوندی میں کچھ اور ہی پیشِ نظر تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس مقام و مرتبہ کا اظہار ہرگز نہ ہو پاتا اگر یہ پوری صورتِ حال اس طرح پیش نہ آتی جیسی کہ فی الواقع پیش آئی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان تمام فتنوں کا استیصال فرماتے اور ان تمام انقلاب دشمنوں کا سر کچل کر انقلابِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو از سرِ نو مستحکم فرماتے۔ کل اڑھائی برس میں آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے رفیقِ غار صلی اللہ علیہ وسلم کے انقلاب کو مستحکم کیا اور پھر اللہ کی طرف مراجعت اور اپنے رفیقِ غار، اپنے محبوب، اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں تاقیامِ قیامت استراحت فرمائی۔

دوسری جانب چونکہ خلافتِ راشدہ درحقیقت نبوی مشن کی تکمیل کا ذریعہ ہے، یہی وجہ ہے کہ جب لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے یہ کہنا شروع کیا کہ آپ خلیفۃ اللہ ہیں یا خلیفۃ المسلمین ہیں، تو انہوں نے فرمایا نہیں! میں تو خَلِیْفَۃُ رَسُوْلِ اللّٰہِ ہوں۔ خلافتِ راشدہ کو اسی وجہ سے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا گیا ہے "نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ عامہ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے مقاصد میں سے جس مقصد کا تعلق پورے عالمِ ارضی سے تھا اس کی تکمیل کے لئے جس عمل کا آغاز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس فرمایا تھا اس کو بھی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھایا۔

جیشِ اسامہ رضی اللہ عنہ کا معاملہ اس حوالے سے بہت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ ان کے بارے میں بھی بہت سے حضرات نے پُرخلوص مشورہ دیا کہ فی الوقت اندرونِ ملکِ عرب اتنے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں کہ اگر آپ صرف ان سے نبرد آزما ہو جائیں تو بہت کافی ہے، سردست اس لشکر کی روانگی ملتوی فرما دیجئے۔ لیکن یہاں بھی وہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اسی عزیمت کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ جس لشکر کی روانگی کا فیصلہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اس کی روانگی کو موخر کرنے والا میں کون ہوں؟ یہ تو پھر خلافت کا تقاضا نہ ہوا" یہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کئے ہوئے فیصلوں کا ایک

ہے 'اُن میں ترمیم ہو جائے گی۔ چنانچہ جیشِ اُسامہ رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا گیا reversal اور اس فیصلہ کو بھی قائم رکھا گیا کہ اس کی سرکردگی حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو دی گئی' حالانکہ وہ بالکل نوجوان تھے۔ اس پر بھی جب یہ کہا گیا کہ ذرا اس فیصلے میں ترمیم کر لیجئے تو پھر اس جانشین رسول کا وہی قول سامنے آیا کہ جس کو عَلَم سنبھلوایا ہو محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے 'میں اُس کے ہاتھ سے عَلَم لینے والا کون ہو سکتا ہوں؟

حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ جب لشکر لے کر چلے تو ان کے ساتھ ساتھ خلیفۂ وقت پیدل چلے اور جب حضرت اُسامہؓ احتراماً سواری سے اترنے لگے تو منع فرما دیا۔ یہ ہے شان حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اور یہ ہے درحقیقت مقام اور مرتبہ خلافتِ صدّیقی کا!

ایک اور بہت بڑا احسان جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اُمّتِ مُسلمہ پر فرمایا' وہ ہے قرآن مجید کا جمع کرنا' جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ تک معروف معنیٰ میں ایک کتاب کی شکل میں جمع نہ تھا' یعنی "مَابَیْنَ الدُّفَّتَیْنِ" جیسے ایک کتاب ہوتی ہے' جلد کے دو گتوں کے مابین' صفحات میں مرتّب صورت میں لکھی ہوئی' ایسے نہ تھا۔ اگرچہ ترتیب کا حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دے دیا تھا۔ ترتیب آپؐ نے قائم بھی فرما دی تھی۔ آیات کو جمع کر کے سورتوں کی شکل دینا اور سورتوں کا باہمی نظم اور ربط' یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کر دیا تھا۔ لیکن ابھی کسی کے پاس لکھی ہوئی کچھ سورتیں تھیں' کسی کے پاس کچھ اور دوسری سورتیں تھیں' کہیں کپڑے پر لکھی ہوئی' کہیں ہڈیوں پر لکھی ہوئی' کہیں کاغذوں پر لکھی ہوئی' اور سب سے بڑھ کر لوگوں کے سینوں میں قرآن مجید محفوظ تھا۔ لیکن جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں بہت سی جنگیں ہوئیں اور ان میں بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے جامِ شہادت نوش فرمایا' خصوصاً جنگِ یمامہ میں بہت سے حُفّاظ شہید ہو گئے' تب یہ خیال پیدا ہوا کہ قرآن ایک مصحف کی صورت میں محفوظ کیا جائے۔ اس خیال کو سب سے پہلے ظاہر کرنے والے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں کہ قرآن مجید کو ایک مصحف کی شکل میں جمع کر لیا جائے' ایسا نہ ہو کہ حفّاظ کی کثیر تعداد شہید ہو جائے اور کہیں قرآن مجید کا کوئی حصہ ضائع ہو جائے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ کہ:

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ ﴾ (الحجر : ۹)

"ہم نے ہی اس ذکر کو نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں"۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں اس ارادۂ خداوندی کی تکمیل ہوئی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کاتبِ وحی رہے تھے، حکم دیا کہ وہ قرآن مجید کو جمع کریں۔ وہ یہ فرماتے ہیں کہ مجھے اگر کسی پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی خدمت سپرد کی گئی ہوتی تو وہ بھی مجھ پر اتنی بھاری نہ ہوتی جتنا بوجھ میں نے اس ذمہ داری کا محسوس کیا۔

بہرحال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجۃ الوداع میں تو یہ ہدایت فرمائی تھی کہ:

((وَقَدْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ: كِتَابُ اللّٰهِ)) (صحیح مسلم، کتاب الحج)

"اور چھوڑے جا رہا ہوں میں تمہارے درمیان وہ چیز جس کا سرشتہ اگر مضبوطی سے تھامے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو سکو گے، اور وہ چیز ہے کتاب اللہ۔"

یعنی اے میری اُمت! میں جا رہا ہوں لیکن تمہیں بے سہارا اور بے یارومددگار نہیں چھوڑ کر جا رہا، بلکہ تمہارے مابین وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ جسے اگر مضبوطی سے تھام لو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے، اور وہ اللہ کی کتاب ہے۔ تو یہ بھی مقامِ صدیقیت اور مقامِ نبوت کے باہمی اتصال کا ایک مظہر ہے کہ اس کتاب کو بین الدفتین کی شکل دی حضرت ابو بکر صدیق نے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس کتابِ الٰہی سے صحیح تمتع کی توفیق عطا فرمائے۔

فَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ الْاَمِيْنِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۝

(۱۴)

انقلابِ نبویؐ کی توسیع
خلافتِ فاروقی و عثمانی رضی اللہ عنہما

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ ..... ﴾ (النور : ۵۵)

"اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے' اور ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے......"

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے بجا طور پر اس رائے کا اظہار فرمایا ہے کہ خلافتِ راشدہ در حقیقت نبوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا تتمہ ہے' اور یہ بات اس لئے بالکل قرین قیاس ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت عامہ ہے' یعنی آپؐ کی بعثت پوری دنیا کی طرف' تمام عالمِ انسانی کی طرف' اس کے فرائض کی تکمیل خلافتِ راشدہ کے ذریعے ہوئی۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے جس عمل کا آغاز بنفسِ نفیس فرما دیا تھا' اسے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ آنحضور ﷺ نے اپنے دعوتی نامہ ہائے مبارک ارسال فرمائے' پھر غزوۂ موتہ' پھر سفرِ تبوک کے مراحل درپیش ہوئے' اور پھر جیشِ اسامہ کی تیاری اور اس کی روانگی کے انتظام سے جس عمل کا آغاز ہوا اسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں آگے بڑھایا۔ چنانچہ ملک شام میں مسلمانوں کی پیش قدمی آپؓ کے

دورانِ خلافت بھی کافی حد تک ہو چکی تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلامی فتوحات کا سیلاب جس کو بجا طور پر تعبیر کیا علامہ اقبال نے اس طرح کہ : ؎ رُکتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا! یہی نقشہ عہدِ خلافتِ فاروقی اور عہدِ خلافتِ عثمانی میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کی مدت کل دس سال ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارہ سال میں پہلے دس سال کی شان بالکل وہی ہے جو خلافتِ فاروقی کی تھی۔ وہی اتحاد' وہی یکجہتی' وہی ذوقِ جہاد' وہی جوشِ عمل' وہی شوقِ شہادت جو ہمیں دورِ نبوی میں اور عہدِ صدیقی رضی اللہ عنہ میں نظر آتا ہے' ان بیس سالوں کے دوران یعنی خلافتِ فاروقی و عثمانی میں بھی تمام و کمال نظر آ رہا ہے۔ البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کے آخری دو سال میں افتراق و انتشار بھی ہوا اور فتنہ و فساد کی شکل بھی سامنے آگئی' جس کے اسباب پر گفتگو کا یہ موقع و محل نہیں۔

بہرحال یہ عمل جو تقریباً ایک ربع صدی تک نہایت آب و تاب کے ساتھ جاری رہا ہے' اس کے بارے میں ایک بات تو یہ جان لینی چاہئے کہ اس کی اصل غرض و غایت کشور کشائی نہ تھی۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

یہ عام دنیوی فتوحات' یا دوسرے فاتحین کی دنیا میں پیش قدمی سے بالکل ایک مختلف معاملہ ہے۔ چنانچہ جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے' جو فاتح ایران ہیں' ایرانیوں کی جانب سے یہ سوال کیا گیا کہ آپ ہم پر کیوں چڑھ آئے ہیں؟ یہ جنگ کس لئے ہے؟ ہمارے مابین تو کوئی تنازعات نہیں رہے تھے' تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے وہ جواب دیا جو تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے اور جو تاقیامِ قیامت روشن و تاباں رہے گا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ایرانیوں کے سوال کے جواب میں کہا :

اِنَّا قَدْ اُرْسِلْنَا لِنُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ ظُلُمَاتِ الْجَهَالَةِ اِلٰی نُوْرِ الْاِیْمَانِ وَمِنْ جَوْرِ الْمُلُوْكِ اِلٰی عَدْلِ الْاِسْلَامِ

کہ ہم بھیجے گئے ہیں' ہم خود نہیں آئے' ہم ایک مشن پر ہیں اور وہ مشن کیا ہے؟ وہ مشن یہ ہے کہ ہم نوعِ انسانی کو جہالت کے اندھیروں سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لائیں اور بادشاہوں کے ظلم و ستم سے نجات دلا کر اسلام کے عدل سے روشناس کریں۔ چنانچہ یہ وہی بات ہے کہ اصل مقصد شہادتِ حق تھا۔ شہادت کے ایک معنی اللہ کی راہ میں گردن کٹوا دینے کے بھی ہیں' اور اس طرح گویا کہ یہ ہر مجاہد فی سبیل اللہ کا ایک انفرادی نصب العین ہے۔ یہ وہ تمنا ہے کہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ خود محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان پر آ رہی ہے۔ چنانچہ احادیث میں یہ دعائیں منقول ہیں :

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ [1]

"اے اللہ! میں تجھ سے تیرے راستہ میں شہادت کا طلب گار ہوں"۔

اور

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ [2]

"اے اللہ! مجھے اپنے راستہ میں شہادت عطا فرما"۔

جبکہ رسول اللہ ﷺ کی یہ آرزو تو متعدد احادیث میں الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ وارد ہوئی ہے:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ' لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیَا' ثُمَّ اُقْتَلُ' ثُمَّ اُحْیَا' ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ))

(صحیح البخاری' کتاب الجھاد والسیر)

"اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! میری آرزو ہے کہ میں اللہ کی راہ میں (جہاد کروں اور) قتل کر دیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر (اللہ کی راہ میں) قتل ہونے کی سعادت سے شاد کام ہوں' اور پھر زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں!"

یہ بات دوسری ہے کہ اپنے رسولوں کے بارے میں اللہ کی یہ سنت ہے' اس کا یہ اٹل قانون ہے کہ وہ مغلوب نہیں ہو سکتے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿ کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ

اَنَا وَرُسُلِیْ ﴾ "اللہ نے یہ لکھ دیا ہے کہ لازماً میں اور میرے رسول ہی غالب رہیں گے"۔ اور جو مغلوب نہیں ہو سکتا ظاہر ہے کہ وہ مقتول کیسے ہو سکتا ہے! چونکہ قتل مغلوبیت کی علامت ہے لہٰذا حضور ﷺ کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ لیکن لفظ شہید کے ایک دوسرے معنی بھی ہیں جس کی رو سے ہر رسول شہید ہے اور اس شہید کے معنی ہیں گواہ۔ اسی بات کو سورۃ النساء کی آیت ۴۱ میں واضح کیا گیا کہ عدالتِ اخروی میں تمام رسول شہید یعنی گواہ بنا کر پیش کئے جائیں گے۔ فرمایا :

﴿ فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَھِیْدٍ وَّجِئْنَا بِکَ عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ شَھِیْدًا ؀ ﴾

"پس سوچو کہ اُس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر (اے محمد ﷺ!) آپ کو گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے"۔

یہ شہادت علی النّاس کا فریضہ اپنے قول اور اپنے عمل سے دنیا میں حق کی گواہی دینا ہے۔ اور یہی وہ فریضہ ہے جو حضرت محمد ﷺ اُمت کے حوالے فرما کر اس دنیا سے تشریف لے گئے تھے۔ چنانچہ یہ بات سورۃ البقرہ میں بایں الفاظ وارد ہوئی :

﴿ وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا ﴾ (آیت ۱۴۳)

"(اے مسلمانو!) ہم نے اسی طرح تمہیں ایک بہترین اُمت بنایا ہے' تاکہ تم گواہی دو پوری نوعِ انسانی پر اور اللہ کے رسول گواہ ہو جائیں تم پر"۔

یہ بات سورۃ الحج (آیت ۷۸) میں بھی آئی ہے۔ وہاں مسلمانوں کو للکارا جا رہا ہے اور ان کو حکم دیا جا رہا ہے کہ :

﴿ وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ ھُوَ اجْتَبٰکُمْ .... ﴾

"اور اللہ کی راہ میں محنت کرو' جدوجہد کرو جیسا کہ اس کے لئے محنت اور سعی و کوشش کرنے کا حق ہے۔ اللہ نے تمہیں چن لیا ہے...."

یہ چناؤ' یہ انتخاب اور یہ "اجتباء" کس مقصد اور کس غایت کے لئے کیا گیا ہے! اس کو اسی آیت میں آگے ان الفاظ میں واضح کیا گیا:

﴿ لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۚ ﴾

"تاکہ رسول گواہی دے تم پر اور تم گواہی دو پوری نوعِ انسانی پر"۔

چنانچہ خلافتِ راشدہ کے دوران ہمیں وہ نظامِ دینِ حق' وہ نظامِ عدلِ اجتماعی انصاف و قسط کے اصول پر بالفعل قائم و نافذ نظر آتا ہے جس کی آج کے انسان کو اصل ضرورت ہے۔ یہ بات پہلے واضح کی جا چکی ہے کہ جہاں تک انفرادی اخلاقیات کا تعلق ہے سابقہ انبیاء و رسل کے ہاں بھی وہ اپنے پورے نقطۂ عروج پر ہیں' اگرچہ اس اعتبار سے بھی ایک امتیازی شان ہے سیرتِ محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی کہ ہم اس میں تمام اخلاقی اقدار کو ایک بڑے توازن اور جامعیت کے ساتھ سمویا ہوا پاتے ہیں' لیکن نبی اکرم ﷺ کا اصل احسان' آپ کی اصل contribution وہ نظامِ اجتماعی ہے جس میں عدل و قسط ہے' انصاف ہے۔ ظلم سے پاک معاشرہ اور وہ نظام جو حضور ﷺ نے دیا' ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی پوری exfoliation' اس کی برکات کا اتمام و کمال ظہور گویا lily in bloom نظر آتا ہے دورانِ خلافتِ راشدہ میں' اس لئے کہ حضور ﷺ کے عہد میں تو ابھی انقلاب کا عمل جاری تھا' ابھی انقلاب تکمیل کو پہنچا ہی تھا کہ حضور ﷺ نے "رفیقِ اعلیٰ" کی طرف مراجعت اختیار فرمائی۔

اس نظام کی برکات ظاہر ہوئیں بالخصوص دورِ فاروقی اور دورِ عثمانی میں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف حریت ہے تو اس کا عالم یہ ہے کہ ایک خاتون بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے فرماں روا کو ٹوک سکتی ہے۔ اور ایک خاتون کی تنقید پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنا ایک آرڈیننس واپس لے لیتے ہیں' جاری شدہ حکم منسوخ فرما دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک گدڑی پوش' ایک درویش ہے تو سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بر سرِ عام

عمر رضی اللہ عنہ کو ٹوک دیتا ہے اور دورانِ خطبہ کہتا ہے: لَا سَمْعَ وَلَا طَاعَۃَ یعنی نہ سنیں گے اور نہ اطاعت کریں گے۔ اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ دریافت کرتے ہیں کہ معاملہ کیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک خالص نجی تنقید ہے کہ یہ کرتا جو آپ نے پہنا ہوا ہے' اُن چادروں سے بنا ہے جو مالِ غنیمت میں آئی تھیں اور ہر مسلمان کو جتنا حصہ ملا تھا اس سے کرتا نہیں بنتا اور آپ تو ہم میں سے ہیں بھی طویل القامت انسان' تو یہ کرتا کیسے بن گیا؟ وقت کے عظیم ترین فرماں روا پر عین مجمع عام میں یہ بالکل ذاتی تنقید ہو رہی ہے۔ آزادی اور حریت کا یہ عالم ہے' اظہارِ رائے کی یہ کیفیت ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ وضاحت کے لئے اپنے بیٹے کو حکم دیتے ہیں کہ عبداللہ! لوگوں کو اصل صورتِ حال بتلاؤ۔ اور جب وہ صراحت فرما دیتے ہیں کہ میں نے اپنے حصے کا کپڑا بھی اباجان کو دے دیا تھا تاکہ ان کی قمیص مکمل ہو جائے تو اب وہی درویشِ بے نوا علی الاعلان کہتا ہے: اَلْاٰنَ نَسْمَعُ وَنُطِیْعُ "ہاں اب ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے!"

مساوات اگر کوئی قدر ہے' اور یقیناً ایک اعلیٰ قدر ہے' تو اس کا بھی ہمیں یہ منظر نظر آتا ہے کہ وقت کی عظیم ترین مملکت کا فرماں روا عمر فاروق رضی اللہ عنہ جس کے نام سے قیصر و کسریٰ کے ایوانوں میں لرزہ طاری ہے' وہ بیت المقدس کا سفر کر رہا ہے اور کس شان سے! یہ ذاتی سفر نہیں ہے' سرکاری فرائض کی ادائیگی کے لئے جا رہے ہیں' لیکن ایک اونٹ اور ایک خادم کے ساتھ ـــــ اور حال یہ ہے کہ ایک منزل خلیفۃ المسلمین اونٹ کے اوپر بیٹھے ہوئے ہیں اور غلام یا خادم نکیل تھامے آگے چل رہا ہے' اور اگلی منزل میں معاملہ بالکل برعکس ہے کہ خادم اونٹ کی سواری کر رہا ہے اور خلیفۃ المسلمین نکیل تھامے ہوئے آگے آگے پیدل چل رہے ہیں ـــــ اسی طرح عدل اگر حقیقتاً کسی شے کا نام ہے تو یہ بتمام و کمال نظر آئے گی اسی عہدِ خلافتِ راشدہ میں کہ مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا بیٹا مصر میں ایک قبطی کو ناحق مارتا ہے' اور وہ قبطی حج کے موقع پر فریاد لے کر آتا ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس

قبطی کے ہاتھ سے گورنر کے بیٹے کو قصاص میں کوڑے لگواتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ذرا ایک دو ضربیں اس کے والد کو بھی لگاؤ' اس لئے کہ درحقیقت اس نے اپنے باپ کی گورنری کے زعم ہی میں تم پر یہ ظلم کیا تھا۔ (وہ مصری کہتا ہے کہ نہیں' مجھے میرا بدلہ مل گیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے زمانے میں قاضی کی عدالت میں پیش ہوتے ہیں اور اُن کا دعویٰ صرف اس لئے خارج ہو جاتا ہے کہ ان کے پاس گواہیاں صرف دو تھیں' ایک اپنے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اور ایک غلام کی' اور عدالت فیصلہ کرتی ہے کہ کسی شخص کے حق میں اس کے بیٹے اور اس کے ذاتی غلام کی گواہی قبول نہیں ہو سکتی لہٰذا آپ کا دعویٰ خارج ہے۔

حریت ہو' مساوات ہو' عدل و انصاف ہو' یہ تمام اقدار کہ جن کی یوں سمجھئے کہ نوعِ انسانی کو شدید ضرورت ہے' ان سب کو ایک معتدل نظام کے اندر سمو کر اس عدلِ اجتماعی کو بالفعل خلافت راشدہ نے قائم کر کے اور عملاً چلا کر دکھا دیا' جس کے لئے آج نوعِ انسانی تڑپ رہی ہے۔ یہ ہے وہ حجت جو خلافتِ راشدہ کے ذریعے تاقیامِ قیامت نوعِ انسانی کے لئے قائم ہو چکی ہے۔

فَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى وَآلِهٖ اَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَ آخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ OO

حواشی

(۱) دستیاب کتب حدیث میں یہ دعائیہ الفاظ رسول اللہ ﷺ سے کسی مرفوع روایت میں نہیں مل سکے۔ تاہم موطا امام مالک میں یہ الفاظ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دعا کے ضمن میں روایت ہوئے ہیں۔ ملاحظہ ہو موطا امام مالک' کتاب الجهاد' باب ما تکون فیه الشهادة' ح ۱۰۰۶۔ (مرتب)

(۲) یہ بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی دعا کے الفاظ ہیں۔ ملاحظہ ہو صحیح البخاری' کتاب الحج' باب کراهية النبي ﷺ ان تعرى المدينة' ح ۱۷۹۱۔ (مرتب)

(۱)

اُمتِ محمد ﷺ کی تاریخ کے اہم خد و خال

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿ وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ○ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ؕ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ○ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ○ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۟ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ○ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ○ ﴾

(بنی اسرائیل : ۴۔۸)

"اور ہم نے (ان کی) کتاب (توراۃ و دیگر صحف) میں بنی اسرائیل کو اس بات پر بھی متنبہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد عظیم برپا کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔ آخر کار جب ان دو میں سے پہلی سرکشی کا موقع آیا تو (اے بنی اسرائیل!) ہم نے تمہارے مقابلے میں اپنے ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زور آور تھے اور وہ تمہارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے۔ یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہو کر ہی رہنا تھا۔ اس کے بعد ہم نے تمہیں ان پر غلبے کا موقع دے دیا اور تمہیں مال اور اولاد سے مدد دی اور تمہاری تعداد پہلے سے بڑھا دی۔ دیکھو! تم نے بھلائی کی تو وہ تمہارے اپنے ہی لئے بھلائی

تھی اور برائی کی تو وہ تمہاری اپنی ذات کے لئے برائی کا باعث ہوئی۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے تمہارے دشمنوں کو تم پر مسلّط کر دیا تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (بیت المقدس) میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے اسے تباہ کر کے رکھ دیں۔ ہو سکتا ہے کہ اب تمہارا رب تم پر رحم کرے' لیکن اگر تم نے اپنی سابق روش کا اعادہ کیا تو ہم بھی پھر اپنی سزا کا اعادہ کریں گے۔ اور کفرانِ نعمت کرنے والے لوگوں کے لئے ہم نے جہنم کو قید خانہ بنا رکھا ہے۔"

قرآن حکیم کے بالکل وسط میں سورۂ بنی اسرائیل واقع ہے۔ اس کے پہلے رکوع میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے چار ادوار کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فیصلے کا' جس کا اعلان ان کی کتاب (تورات و دیگر صحف) میں کر دیا گیا تھا' اظہار فرمایا ہے کہ ان پر اپنی تاریخ کے دوران دو مرتبہ عذابِ الٰہی کے کوڑے برسے ہیں۔

ترمذی شریف کی ایک حدیث میں آنحضور ﷺ کا یہ فرمان نقل ہوا ہے :

((لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ مَا اَتٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ))

"میری امت پر بھی وہ تمام احوال وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے تھے' بالکل ایسے جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے مشابہ ہوتا ہے۔"

اس حدیث کی روشنی میں اگر ہم دیکھیں تو اُمّتِ مُسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ بھی چار ادوار میں منقسم نظر آتی ہے' جیسے چار ادوار بنی اسرائیل کی تاریخ میں نظر آتے ہیں۔ دو عروج اور دو زوال —— ان کے عروجِ اوّل کا نقطۂ کمال (Climax) حضرت طالوت' حضرت داؤد اور حضرت سلیمان ؑ کا عہدِ حکومت ہے۔ اس کے بعد زوالِ اوّل آتا ہے' جو ۵۸۷ قبل مسیح میں اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ بخت نصر (جسے "نبوکد نضر" بھی کہا گیا ہے) کے حملے کے وقت بیت المقدس تباہ و

برباد ہو کر رہ جاتا ہے' ہیکلِ سلیمانی مسمار کر دیا جاتا ہے' لاکھوں یہودی قتل ہوتے ہیں اور چھ لاکھ یہودیوں کو وہ اسیر بنا کر بابل (Babilonia) لے جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر ان کے عروج کا ایک دور آتا ہے' جس کا سب سے بڑا مظہر سلطنتِ مکاّوی کا ظہور ہے۔ پھر وہ اپنے دوسرے زوال سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس کا آغاز ۷۰ء میں رومی جنرل طائطس (Titus) کے حملے سے ہوتا ہے' جس نے پھر بیت المقدس کو تاخت و تاراج کیا۔ اس کے بعد سے اب تک بنی اسرائیل پستی و زوال اور اضمحلال کا شکار ہیں۔ وقفے وقفے سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کے کوڑے ان کی پیٹھ پر برس رہے ہیں۔ ماضیِ قریب میں سلطنتِ اسرائیل کی شکل میں انہوں نے ذرا سا سانس لیا ہے' لیکن یہ معلوم ہے کہ وہ بھی اپنے بل بوتے پر نہیں بلکہ امریکہ کی شہ پر اور اسی کے سہارے ہے۔

اس نقشے کو پس منظر میں رکھئے اور اب آیئے اُمّتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تاریخ کی جانب۔ ہمارا عروج اوّل تقریباً ۴۰۰ سال پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ عروج ساتویں' آٹھویں' نویں اور دسویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے۔ یہ عروج عربوں کی زیرِ قیادت ہوا۔ یہ چار سو سال ایسے گزرے ہیں کہ زمین پر عظیم ترین مملکت' اسلامی مملکت تھی۔ اور یہ اسلامی مملکت صرف ایک عسکری اور سیاسی قوت نہ تھی بلکہ اس میں تہذیب و تمدن اور علوم و فنون اپنے پورے نقطۂ عروج کو پہنچے ہوئے تھے۔ یہ ہمارا پہلا عروج ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ انسانی میں اس سے پہلے اتنی عظیم الشان مملکت کی کوئی مثال موجود نہیں تھی۔ لیکن پھر ہمارا زوال آیا۔ اس زوال کا اصل سبب جان لینا چاہئے کہ قرآن مجید میں بطور تنبیہہ (Warning) ارشاد فرمایا گیا تھا:

﴿ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ﴾ (محمد : ۳۸)

یعنی اے محمد (ﷺ)! کے ماننے والو! اگر تم نے پیٹھ موڑ لی' ان مقاصد کی تکمیل کے بجائے جو محمد (ﷺ) کے اُمتی ہونے کی حیثیت سے تمہارے سپرد کئے گئے ہیں' اگر تم

نے اپنی ذاتی منفعت اور ذاتی اقتدار کو ہی مطلوب و مقصود بنا لیا اور تم بھی دنیا کے عیش میں پڑ گئے تو جان لو کہ ہماری سنت کا ظہور ہو گا۔ ہم تمہیں ہٹائیں گے، کسی اور کو لے آئیں گے۔

ظاہری اعتبار سے اسباب زوال کا خلاصہ مطلوب ہو تو وہ علامہ اقبال کے اس شعر میں موجود ہے ۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل ' طاؤس و رباب آخر!

چنانچہ جب ہمارا حال بھی "طاؤس و رباب آخر" کی تصویر بن گیا تو ہم زوال سے دوچار ہوئے۔ عذاب الٰہی کے کوڑے ہماری پیٹھ پر برسے' پہلے صلیبیوں کی شکل میں اور پھر فتنہ تاتار کی صورت میں۔ پھر ۱۲۵۸ء میں وہ اپنے پورے نقطۂ عروج کو پہنچ گئے جب سلطنت یا خلافت بنی عباس کا چراغ گل ہو گیا اور عالمِ اسلام پورے کا پورا ایسے ضعف و اضمحلال کا شکار ہوا کہ بظاہر احوال کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اسے دوبارہ بھی اٹھنا نصیب ہو گا۔ لیکن پھر اسی سنّتِ الٰہی کا ظہور ایک عجیب شان کے ساتھ ہوا۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ۔

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!

اللہ نے جن کو عذاب کا کوڑا بنا کر مسلمانوں کی پیٹھ پر برسایا تھا' انہی کو ایمان و اسلام کی توفیق عطا فرما دی' انہی کے ہاتھ میں اپنے دین کا علم تھما دیا۔ چنانچہ یہ تین ترک قبیلے ہی ہیں کہ جن کی زیرِ سیادت و قیادت پھر اسلام کو اپنے دوسرے عروج کا دور دیکھنا نصیب ہوا۔ ترکانِ تیموری نے ہندوستان میں ایک عظیم مملکت قائم کی۔ صفوی حکومت جو ایران میں قائم ہوئی' اصلاً وہ بھی ایک ترک حکومت تھی۔ پھر سلطنت عثمانیہ (ترکی) قائم ہوئی اور پورا عالم عرب اور پورا شمالی افریقہ اس کے زیر نگیں آیا۔ انہی کے ہاں پھر خلافت کا احیاء ہوا۔ چوتھی بنو امیہ کی وہ سلطنت جو اندلس میں

تھی۔ ان چار عظیم مملکتوں کی صورت میں دنیا میں پھر مسلمانوں کی سطوت کا ڈنکا بجا۔
لیکن اس عروج کے بعد پھر زوالِ ثانی آیا۔ یہ درحقیقت یورپی استعمار کے ہاتھوں آیا۔ اس کا نقطۂ آغاز پندرہویں صدی عیسوی کے اختتام پر سلطنتِ اندلس (ہسپانیہ) کا زوال ہے۔ ۱۴۹۲ء میں سقوطِ غرناطہ کے بعد یوں سمجھئے کہ وہاں سے مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹ گئی جس کا مرثیہ علامہ اقبال نے اس طرح کہا ہے :

غلغلوں سے جس کی لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے؟

اس کے بعد ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما نے وہ راستہ تلاش کر لیا جس سے مغربی استعمار کا سیلاب عالمِ اسلام کے دائیں بازو یعنی مشرق بعید (Far East) پر حملہ آور ہوا۔ ملایا اور انڈونیشیا کی مملکتیں اور اس کے بعد ہندوستان کی عظیم سلطنت مغربی استعمار کا نوالہ بن گئیں۔ ہماری بڑی بڑی سلطنتیں اور مملکتیں کچے گھروندوں کی مانند مغربی استعمار کے سیلاب میں بہتی چلی گئیں۔ یہ عمل بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا جب پہلی جنگِ عظیم کے بعد دنیا کا یہ نقشہ سامنے آیا کہ سلطنتِ عثمانیہ ختم ہو گئی اور ترکی کے نام سے ایک چھوٹا سا ملک باقی رہ گیا۔ پورا عالمِ عرب مغلوب ہو گیا، اس کے حصے بخرے کر لئے گئے۔ اس کی خبر دی تھی نبی اکرم ﷺ نے ان الفاظ میں کہ :

((يُوشِكُ الْأُمَمُ أَنْ تَدَاعٰى عَلَيْكُمْ كَمَا تَدَاعَى الْأَكَلَةُ إِلٰى قَصْعَتِهَا))

یعنی "مسلمانو! اندیشہ ہے کہ تم پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ اقوامِ عالم تم پر ایک دوسرے کو ایسے دعوت دیں گی جیسے دعوتِ طعام کا اہتمام کرنے والا دسترخوان چنے جانے کے بعد مہمانوں کو بلایا کرتا ہے کہ آیئے اب کھانا تناول فرمایئے۔ اس طرح تم اقوامِ عالم کے لئے لقمۂ تر ہو جاؤ گے"۔

صحابہ نے بڑے تعجب کے ساتھ سوال کیا :

مِنْ قِلَّةٍ [illegible]

"حضور [illegible] اس روز ہماری تعداد بہت کم ہو جائے گی؟"

حضور ﷺ نے فرمایا:

((بَلْ اَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيْرٌ ' وَلٰكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ ' وَلَيَنْزِعَنَّ اللّٰهُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ وَلَيَقْذِفَنَّ فِيْ قُلُوْبِكُمُ الْوَهْنَ))

یعنی "نام کے مسلمان تو بہت ہوں گے۔ تمہاری تعداد تو بہت ہو گی لیکن تمہاری حیثیت سیلاب کے اوپر کے جھاگ کی مانند ہو کر رہ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دل سے تمہاری ہیبت نکال باہر کرے گا اور خود تمہارے دلوں میں وہن (کی بیماری) ڈال دے گا"۔

اس پر سوال ہوا:

مَا الْوَهْنُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟

"اے اللہ کے رسول! وہن کیا چیز ہے؟"

تو آپ ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا:

((حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ))

"دنیا کی محبت اور موت سے کراہت"۔

یہ حدیث سنن ابی داؤد "کتاب الملاحم" میں وارد ہوئی ہے۔ یہ فتنہ جو ہمیں اس حدیث نبوی میں نظر آتا ہے' بیسویں صدی کے بالکل آغاز میں عالم اسلام میں بچشم سر دیکھا گیا ہے۔ وہ وقت تھا جب ایک دل دردمند کی صدا نغمے میں آئی تھی۔ مولانا حالی نے مسدس کی پیشانی پر جو شعر لکھے ہیں وہ اسی صورت حال کے عکاس ہیں:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے!

اور خاتمے پر حضور سرورِ عالم ﷺ سے جو مناجات ہے' اس کا آغاز ان اشعار سے ہوا —

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
اُمّت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے!

یہ تھا نقشہ بیسویں صدی کے آغاز میں۔ البتہ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ اس کے بعد سے اب تک ایک دوہرا عمل ہمارے سامنے آیا ہے۔ ایک طرف ہمارے انحطاط اور زوال و اضمحلال کے سائے مزید گہرے ہوتے چلے گئے' بیت المقدس دوسری مرتبہ ہمارے ہاتھ سے چھنا اور اب بھی وہ ایک مغضوب علیہم قوم کے قبضے میں ہے' سقوطِ ڈھاکہ اور عرب اسرائیل جنگوں میں جو مسلمانوں کو شکستیں ہوئیں' یہ عذابِ الٰہی کے کوڑے ہیں جو ہماری پیٹھ پر برس رہے ہیں۔ لیکن دوسری طرف ایک احیاء و تجدید کی تحریک بھی شروع ہو چکی ہے اور ایک احیائی عمل کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔ اس کے پہلے مرحلے (Phase) سے بحمد اللہ اور بفضلہ تعالیٰ اُمّتِ مُسلمہ کسی حد تک گزر بھی چکی ہے۔ چنانچہ پورے عالمِ اسلام سے مغربی استعمار کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے۔ اس سیلاب کا رخ موڑا جا چکا ہے۔ سیاسی اعتبار سے تقریباً پورا عالمِ اسلام آزادی حاصل کر چکا ہے' اگرچہ ذہنی غلامی ابھی باقی ہے' تہذیبی و علمی اور فنی غلامی ابھی برقرار ہے۔

بایں ہمہ یہ بھی بہت بڑی نعمت ہے کہ سیاسی طور پر عالمِ اسلام کی عظیم اکثریت آزادی سے ہمکنار ہو چکی ہے۔ تاہم اصل کام ابھی باقی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

وہ کام جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ اُمت کے حوالے فرما کر گئے تھے' آپؐ کی جو امانت ہمارے پاس ہے' وہ فرضِ منصبی جو بحیثیت امت ہمارے کاندھوں پر ہے جب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے کاندھے پر آیا تھا تو وحیٔ آسمانی نے پیشگی طور پر فرما دیا تھا کہ :

﴿ اِنَّا سَنُلْقِىْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝ ﴾ (المزمل:۵)

"(اے محمد ﷺ!) ہم آپؐ پر ایک بڑی بات ڈالنے والے ہیں"۔

یہی بھاری بوجھ ہے جو اب اُمّتِ مُسلمہ کے کاندھے پر ہے۔ یہ اُمّت پیغامِ محمدیؐ کی امین ہے' یہ دینِ خداوندی کی علمبردار ہے۔ اس پیغام کو پوری نوعِ انسانی تک پہنچانا اس کے ذمہ ہے۔ اس دین کو قائم اور نافذ کرنا اور پھر نوعِ انسانی کو اس نظامِ عدلِ اجتماعی سے روشناس کرانا جو محمد رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں لائے تھے' یہ ہے ہمارا فرضِ منصبی' یہ ہیں ہماری ذمہ داریاں۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں ہمارا عروج اور ہماری عزت و وقار کا معاملہ دوسری قوموں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ ہم دنیا میں معزز اور سربلند اُس وقت تک نہیں ہو سکتے جب تک ہم اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے محنت' سعی و کوشش اور جدوجہد نہ کریں ؎

اپنی مِلّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ!

گویا ہمارے عروج و زوال کا معاملہ دنیا کی عام قوموں کے عروج و زوال کے اسباب سے بالکل جدا ہے۔ ہمارے ذمہ جو فرضِ منصبی ہے' اگر اس کو ادا کریں گے تو تائیدِ خداوندی ہمارا ساتھ دے گی۔ بقول علامہ اقبال ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں!

فَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ ۝

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۝

(۱۴)

نبیِ اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں
اور
نبوی مشن کی تکمیل اور ہمارا فرض

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ ﴾ (الاعراف: ۱۵۷)

"پس جو لوگ ایمان لائے اُن (نبی کریم ﷺ) پر اور جنہوں نے اُن کی توقیر و تعظیم کی اور جذبۂ احترام کے ساتھ ان کی مدد و حمایت کی (ان کے کام اور ان کے مشن میں ان کے دست و بازو بنے اور ان کے فرضِ منصبی کی تکمیل میں اپنی قوتوں' صلاحیتوں اور توانائیوں کو کھپایا) اور جنہوں نے اس نور کا اتباع کیا جو ان کے ساتھ نازل کیا گیا ہے (یعنی قرآن مجید) تو یہی لوگ ہیں (جو اللہ کے ہاں) فلاح پانے والے (کامیاب و کامران اور شاد کام ہونے والے) قرار پائیں گے"۔

اُمّتِ مُسلمہ اس وقت جس صورتِ حال سے دوچار ہے اس کی تفصیل میں جانے کی چنداں احتیاج نہیں ہے۔ ہر صاحبِ نظر آگاہ ہے کہ عزت و وقار اور سربلندی گویا کہ ہم سے چھین لی گئی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ معاف فرمائے' واقعہ یہ ہے کہ جو مغضوب علیہم قوموں کا نقشہ قرآن مجید میں کھینچا گیا ہے' مختلف اعتبارات سے وہی نقشہ آج ہمیں اپنے اوپر منطبق ہوتا نظر آ رہا ہے۔ افتراق ہے' باہمی خانہ جنگیاں ہیں' اختلافات ہیں۔ وحدتِ اُمّت جو مطلوب ہے تو اس کا شیرازہ پارہ پارہ ہو

چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس صورت حال کا حل کیا ہے؟ اس کے لئے ہم کس طرف رجوع کریں؟ اس کا جواب اگر ایک جملے میں جاننا چاہیں تو وہ یہ ہے کہ خلوص اور اخلاص کا رشتہ اور وفاداری کا تعلق از سرنو اللہ سے' اس کی کتاب سے' اس کے رسول ﷺ سے استوار کیا جائے اور صحیح بنیادوں پر قائم کیا جائے۔

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا :

((اِنَّ الدِّیْنَ النَّصِیْحَةُ)) قُلْنَا لِمَنْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ قَالَ: ((لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِهِمْ)) (مسلم)

"دین تو بس خیر خواہی' خلوص و اخلاص اور وفاداری کا نام ہے"۔ ہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ! کس کی وفاداری' کس سے خلوص و اخلاص؟ ارشاد فرمایا: "اللہ سے' اس کی کتاب سے' اس کے رسول سے' مسلمانوں کے رہنماؤں اور قائدین سے اور عامۃ المسلمین سے"۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلوص و اخلاص کا تعلق ہے تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے' وہ ایک لفظ میں ادا کیا جا سکتا ہے: التزامِ توحید اور شرک سے اجتناب۔ شرک کی ہر نوعیت سے' ہر شائبہ سے اپنے آپ کو پاک کر لیا جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری ہے۔ اگرچہ کام آسان نہیں' بقول علامہ اقبال مرحوم ۔

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے\
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہیں تصویریں

جہاں تک قرآن مجید اور نبی اکرم ﷺ کے ساتھ خلوص و اخلاص کا معاملہ ہے تو یہ درحقیقت دو چیزیں نہیں' ایک ہی ہیں۔ اس لئے کہ قرآن حکیم مصحف ہے' قرآن متلو ہے اور آنحضور ﷺ قرآن مجسم ہیں۔ جیسے کہ فرمایا ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جب ان سے فرمائش کی گئی کہ ہمیں حضور ﷺ کی سیرت بتایئے۔ آپؓ نے سوال کیا: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ اور جب جواب اثبات میں آیا تو آپؓ

نے فرمایا: كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن "حضور ﷺ کی سیرت قرآن ہی تو ہے"۔

اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ خلوص اور اخلاص کے تقاضے کیا ہیں۔ آنحضور ﷺ کے ساتھ ہماری وہ نسبت کیسے قائم ہو سکتی ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے سادہ ترین الفاظ میں تو یوں کہا ہے کہ ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں!

اور بڑے پُر شکوہ انداز میں کہا ؎

بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں چار ہیں۔ آیتِ زیرِ مطالعہ کا پس منظر بڑا عجیب ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنے اور اپنی قوم کے لئے بارگاہِ خداوندی میں رحمت کا سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے جواباً ارشاد فرمایا: میری ایک رحمت تو عام ہے جو تمام مخلوقات کے لئے کھلی ہوئی ہے، اور جو میری رحمتِ خصوصی ہے تو اسے میں نے مخصوص کر دیا ہے ان لوگوں کے لئے جو میرے نبی اُمی سے اپنا صحیح تعلق قائم کریں گے۔ وہ تعلق کیا ہے؟ اس کو ان الفاظ مبارکہ میں بیان کر دیا گیا:

﴿ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾

"جو لوگ ان پر ایمان لائیں گے، ان کی تعظیم کریں گے، ان کی نصرت و حمایت کریں گے اور جو نور ان کے ساتھ نازل کیا گیا ہے (یعنی قرآن) اس کی پیروی کریں گے وہ ہوں گے اصل معنی میں کامیاب (اور میری رحمت خصوصی انہی لوگوں کے حصے میں آئے گی)"۔

اس آیۂ مبارکہ کی روشنی میں غور کیا جائے تو حضور ﷺ کے ساتھ ہمارے

تعلق کی چار بنیادیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

سب سے پہلی بنیاد ہے تصدیق و ایمان۔ یہ تصدیق کرنا کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ آپ نے جو کچھ فرمایا اپنی طرف سے نہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو وحی فرمایا اسی کو نوعِ انسانی کے سامنے پیش فرمایا :

﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلاَّ وَحْيٌ يُّوْحٰى ○ ﴾

(النجم: ۳'۴)

"اور ہمارا نبی اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا' یہ تو ایک وحی ہے جو اُس پر کی جاتی ہے"۔

اب اس ضمن میں یہ جاننا چاہئے کہ اس ایمان اور تصدیق کے دو درجے ہیں' ایک اقرار باللسان یعنی زبانی اقرار کا درجہ ہے۔ اس سے انسان اسلام کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ قانونی ضرورت پوری ہو جاتی ہے جو اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام میں شامل ہونے کے لئے لازمی اور ضروری ہے' لیکن اصلی ایمان "تصدیق بالقلب" کا نام ہے۔ جب آنحضور ﷺ کی رسالت پر' آپ کی نبوت پر دل میں یقین کی کیفیت پیدا ہو جائے تو یہ ہے ایمان مطلوب۔ اس کے بغیر ہم نبی اکرم ﷺ کے جو دوسرے حقوق ہیں وہ ادا نہیں کر سکتے۔ پھر زبانی کلامی تعلق رہے گا' جیسے کہ اللہ معاف فرمائے' ہماری عظیم اکثریت کا فی الواقع ہے۔

دوسرا تعلق ہے تعظیم و محبت۔ یہ لازمی تقاضا ہے یقین قلبی کا۔ اگر یہ یقین ہو کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو آپ کی ایک عظمت کا نقش قلب پر قائم ہو گا اور آپ کی محبت دل میں جاگزیں ہو گی۔ جیسے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا :

((لاَ يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ)) (صحيح البخاری' کتاب الايمان)

"تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے محبوب تر نہ ہو جاؤں اس کے اپنے باپ سے' اپنے بیٹے سے اور تمام انسانوں سے"۔

یعنی اگر ایک مؤمن کے دل میں آنحضور ﷺ کی محبت اپنے تمام اعزہ و اقارب اور تمام انسانوں سے بڑھ کر جاگزیں ہوگئی ہے تو وہ حقیقتاً مؤمن ہے۔ اس حدیث میں باپ اور بیٹے کے ذکر نے تمام عزیزوں، رشتہ داروں، قبیلہ و برادری سب کا احاطہ کر لیا ہے۔ ان الفاظ میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ ایسا نہیں کہ [illegible] ہو بلکہ صاف صاف اور دو ٹوک انداز سے ارشاد ہوا کہ حقیقی ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ حضور ﷺ ایک بندۂ مؤمن کو دنیا کی تمام چیزوں سے محبوب تر ہو جائیں ؎

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

تعظیم ظاہری بھی مطلوب ہے اور قلبی بھی۔ اسی طرح محبت کا زبانی بھی اظہار ہو اور یہ دل میں بھی جاگزیں ہو۔ اور اس کا سب سے بڑا مظہر ہے حضور ﷺ پر درود بھیجنا، جس کے بارے میں یہ بھی فرمایا گیا کہ اگر کوئی شخص اپنی دعا کل کی کل حضور ﷺ پر درود بھیجنے پر مشتمل کر دے تو اس کا مقام اور مرتبہ کہیں زیادہ ہوگا اس سے کہ وہ اللہ سے خود اپنے لئے کوئی سوالات کرتا رہے۔

ان پہلی دو بنیادوں کا لازمی نتیجہ آنحضور ﷺ کی اطاعت اور آپؐ کا اتباع ہے۔ ظاہر بات ہے جب آپؐ کو اللہ کا رسول مانا تو اب آپؐ کے حکم سے سرتابی چہ معنی دارد؟ آپؐ کا ہر حکم سر آنکھوں پر ہوگا۔ اس میں تو البتہ انسان تحقیق کا حق رکھتا ہے کہ واقعتاً رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم دیا ہے یا نہیں، لیکن جب طے ہو جائے کہ یہ آپؐ کا فرمان ہے، یہ آپؐ کا حکم ہے تو اب چون و چرا کا کوئی سوال نہیں۔ اب تو اطاعت کرنی ہوگی۔ اور اطاعت بھی کیسی! وہ اطاعت جس کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ○ ﴾

(النساء: ٦٥)

"پس نہیں! آپ کے رب کی قسم! یہ لوگ ہرگز مؤمن نہیں ہیں جب تک
اپنے نزاعات میں آپ ہی کو حکم نہ مانیں اور جو کچھ آپ فیصلہ فرمائیں اس پر
اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں، بلکہ آپ کے فیصلے کے آگے دل کی
پوری آمادگی اور خوشی کے ساتھ سرِ تسلیم خم کر دیں"۔

یہی بات آنحضور ﷺ نے فرمائی:

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ))

(رواہ فی شرح السُّنّۃ)

"تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہشِ نفس
اس ہدایت کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں"۔

جب اطاعت کے ساتھ محبت کی شیرینی شامل ہو جائے تو اس طرزِ عمل کا نام ہے "اِتّباع" ۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ظاہر ہے کہ اطاعت تو ان احکام کی ہو گی جو حضور ﷺ نے دیے ہوں۔ لیکن اتباع ان تمام افعال و اعمال کا ہو گا جن کا صدور و ظہور نبی اکرم ﷺ سے ہوا — چاہے ان کے کرنے کا حکم حضور ﷺ نے بالفعل نہ دیا ہو۔ اس اتباع کا قرآن مجید میں جو مقام ہے وہ دیکھئے۔ سورۂ آل عمران آیت ۳۱ میں فرمایا:

﴿ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ ﴾

"اے نبی! ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا
اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں کو ڈھانپ لے گا"۔

اس آیۂ کریمہ سے اتباعِ رسول کی یہ اہمیت سامنے آتی ہے کہ اللہ سے محبت کا دعویٰ ہے تو جنابِ محمد رسول اللہ ﷺ کا اتباع لازمی و لابدی ہے۔ اس اتباع کا ایک نتیجہ تو یہ نکلے گا کہ اللہ ہم سے محبت فرمائے گا اور دوسرا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم اس کی مغفرت و عفو کے مستحق قرار پائیں گے۔ اس سے زیادہ ایک بندۂ مؤمن کی خوش

بختی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ کا محبوب اور اس کی مغفرت کا سزاوار بن جائے۔

آنحضور ﷺ کے ساتھ ہمارا تیسرا تعلق جسے یوں کہئے کہ یہ عروج ہے حضور ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کا' وہ ہے آپؐ کی تائید و نصرت۔ حضور ﷺ ایک مشن لے کر تشریف لائے تھے' آپؐ کا مقصدِ بعثت عالمی سطح پر ہنوز شرمندۂ تکمیل ہے ۔

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دورانِ خلافتِ راشدہ اس عمل کو جہاں تک پہنچایا تھا ہم اپنی بے عملیوں کے طفیل وہ اثرات بھی ختم کر چکے ہیں۔ اب تو از سرِ نو پیغامِ محمدیؐ کی نشر و اشاعت کرنی ہے۔ پیغامِ محمدیؐ کو پہنچانا ہے تمام اقوام و مللِ عالم تک اور از سرِ نو اللہ کے دین کو فی الواقع قائم' نافذ اور غالب کرنا ہے پورے کرۂ ارضی پر۔ اور اس کے لئے پہلے جہاں بھی اللہ توفیق دے' جس خطۂ ارضی کی قسمت جاگے کہ وہ اس عہدِ حاضر میں انقلابِ محمدیؐ کا سب سے پہلا Base قرار پائے تو اس ملک کی خوش بختی اور خوش نصیبی پر تو واقعتاً رشک کیا جانا چاہئے۔

یہ ہے وہ فریضۂ منصبی جو اُمت کے حوالے کیا گیا ہے۔ آنحضور ﷺ کا مشن زندہ و تابندہ ہے۔ حضور ﷺ گویا کہ اب بھی پکار رہے ہیں:

﴿ مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ ﴾

"کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں؟"

یعنی کون ہے جو میرے پیغام کی نشر و اشاعت کا کام کرے' میرے دین کا علمبردار بن کر کھڑا ہو اور پورے کرۂ ارضی پر اس کا جھنڈا سربلند کرنے کے لئے تن من دھن لگانے کے لئے آمادہ ہو جائے!

اسی ضمن میں آخری بات آتی ہے اس آیۂ مبارکہ میں کہ اس عمل کا ذریعہ کیا ہے؟ محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے جو انقلاب برپا کیا تو آلۂ انقلاب تھا قرآن حکیم ۔

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

فرمایا:

﴿ هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ (الجمعۃ : ۲)

"وہی اللہ ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے' ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے"۔

پس معلوم ہوا کہ آپؐ کی دعوت کا مرکز و محور قرآن حکیم تھا۔ آپؐ نے لوگوں کی ذہنیتیں بدلیں تو اسی قرآن حکیم سے' لوگوں کی سوچ میں انقلاب برپا کیا تو اسی قرآن حکیم سے' ذہن کی تطہیر فرمائی تو اسی قرآن کی آیاتِ بینات سے' تزکیۂ نفس فرمایا تو اسی قرآن کی آیاتِ بیّنات اس کا ذریعہ بنیں۔ خارج و باطن سب منوّر ہوئے تو اسی قرآن حکیم کے نور سے۔

وہ کتاب موجود ہے اور آیتِ زیرِ مطالعہ میں اسی کے اتباع کا ان الفاظِ مبارکہ میں ذکر ہوا :

﴿ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ﴾

"اور اس نور کا اتباع جو ان (نبی) کے ساتھ اتارا گیا ہے"۔

وہ نور جو آپ ﷺ کے ساتھ نازل کیا گیا وہ نور حضور ﷺ امت کے حوالے کر کے گئے' وہ امت کے پاس محفوظ ہے۔ اس کے ساتھ اپنے تعلق کو درست کرنا ہے۔ یہ آنحضور ﷺ کے ساتھ ہمارے صحیح تعلق کی آخری اور اہم ترین بنیاد ہے۔ یہ وراثتِ محمدیؐ ہے۔ اس کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم ہے اور اسی کو حبل اللہ قرار دیا گیا ہے:

﴿ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ﴾

یہی کتاب اللہ اُمت کے اندر از سرِ نو اتحاد اور یک جہتی پیدا کرے گی' اسی سے وحدتِ فکر پیدا ہو گی' اسی سے وحدتِ عمل پیدا ہو گی' اسی سے ہماری جدّوجُہد یک جہتی کے ساتھ اپنے اصل ہدف کی طرف آگے بڑھے گی۔ اس کتاب کے حقوق کو پہچاننا بھی ہمارے ایمان اور وفاء کی ایک عظیم ضرورت ہے' جیسے نبیؐ اکرم ﷺ کے ساتھ اپنے تعلق کی بنیادوں کو پہچاننا ہمارے حقیقی و قلبی ایمان کے لئے ضروری و لابُدی ہے۔ یہی در حقیقت میلاد النبی ﷺ کا اصل پیغام ہے۔ یہی اصل لمحۂ فکریہ ہے۔ اس کو از سرِ نو سمجھیں اور محمدؐ رسول اللہ ﷺ اور آنحضورؐ کی لائی ہوئی کتابِ مبارک کے ساتھ اپنی نسبت کو پوری درستگی کے ساتھ بتمام و کمال از سرِ نو استوار کریں۔ اس کتاب کو مانیں جیسا کہ اس کے ماننے کا حق ہے۔ اسے پڑھیں جیسا کہ اس کے پڑھنے کا حق ہے۔ اس کو سمجھیں جیسا کہ اس کے سمجھنے کا حق ہے۔ اس پر عمل کریں جیسا کہ اس پر عمل کا حق ہے اور پھر اس کے مبلّغ' داعی اور معلّم بن جائیں جیسے کہ اس کی تبلیغ' دعوت' تعلیم اور تبیین کا حق ہے۔ وَفَّقَنَا اللّٰہُ لِھٰذَا

اللہ تعالیٰ ہمیں ان جملہ امور پر عمل کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ہم نبی اکرم ﷺ کے مشن کی عالمی سطح پر تکمیل کے لئے راست سمت میں پیش قدمی کر سکیں' اور وہ وقت آئے جس کے بارے میں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ جب پورے کرۂ ارضی پر اللہ کا دین غالب اور قائم ہو جائے گا جیسے محمدِ عربی ﷺ نے اپنے عہدِ مبارک میں جزیرہ نمائے عرب پر غالب کر دیا تھا' تو وہ وقت ہو گا جب یہ آیۂ مبارکہ اپنی پوری شان کے ساتھ ظاہر ہو گی:

﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝﴾

فَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝۝